پُرکیف افسانوں کا مجموعہ

ٹیگور کی کہانیاں

مُصنف

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

پبلشر

کنول بک ڈپو امرتسر

قیمت ۸؍

ایڈیٹر

جب میری بیوی زندہ تھی. تب سروج کے لئے مجھے کسی طرح کی فکر نہ تھی. اس وقت سروج کی نسبت اسکی والدہ کیلئے ہی زیادہ مصروف رہتا تھا!

اس وقت صرف سروج کا ہنسنا، کھیلنا دیکھ کر اسکی توتلی ادھوری باتیں سُن کر ہی میں خوش ہوتا تھا. جب تک وہ خوش رہتی اچھا لگتا تھا. اُسے کھیلاتا رہتا لیکن جب وہ رونے لگتی. تب اُس کو اُس کی والدہ کی گود میں لٹا دیتا. اس وقت میں نے یہ نہ سوچا. کہ اس کی ہر بات کا خیال بڑی فکر اور تشویش سے مجھے ہی کرنا ہوگا. ہیضہ کی وبا تمام ملک میں پھیل گئی. میری بیوی بھی اُس کے موذی ہاتھوں سے نہ بچ سکی. ماں کی گود سے بچھڑی ہوئی سروج میری گود میں آگئی. میں نے اُسے محبت سے گود میں لیکر چھاتی سے لگا لیا اور اس یتیم لڑکی کی دوگنی محبت کے ساتھ پرورش و پرداخت کرنا اپنا فرض سمجھا. اور اس لڑکی نے بھی اپنے والد کی خدمت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی!

چھ سات سال کی عمر میں ہی سروج سمجھدار لڑکیوں کی طرح گرہستی کا تمام کام خود کرنے کی کوشش کرنے لگی. وہ چھوٹی سی لڑکی اپنے والد کی دیکھ بھال کرنے والی بننے کی کوشش میں لگ گئی. میں نے دل ہی دل میں ہنس کر خود کو اس کی نذر کر دیا. میں نے دیکھا کہ میں جتنا ہی لاچار بے بس اور بیکار

رہتا ہوں۔ اتنا ہی اُسے اچھا لگتا ہوں۔ اگر میں اپنے ہاتھ سے کپڑا یا چھاتا اُٹھا لیتا۔ تو وہ ایسا خیال ظاہر کرتی۔ جیسے اسی کے کام میں دست اندازی کی جا رہی ہے!

اُسے اتنا بڑا کھلونا پہلے کبھی نہ ملا تھا۔ اسی سے وہ والد کو کھلا پلا کر کپڑے پہنا کر بستر پر سُلا کر دن بھر بڑی خوش رہتی تھی۔ صرف پہاڑے اور بچوں کے دل لگی کے درہے پڑھنے کے وقت وہ میرے والد کے بھائی کو بیدار کر دیتی تھی!

اب دل ہی دل میں مجھے یہ فکر ہونے لگی۔ کہ پڑھے لکھے معزز گھرانے میں کسی لائق لڑکے کے لئے اس کی شادی کے واسطے دو تین ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ مگر میرے پاس اتنے روپے کہاں؟ — میں لڑکی کو اپنی طاقت کے مطابق پڑھاتا لکھاتا تو ضرور ہوں۔ لیکن اگر یہ کسی بے وقوف کے ہاتھ پڑ گئی۔ تو اس کی کیا حالت ہوگی؟

یکایک روپیہ کمانے کی سوجھی۔ سرکاری دفتروں میں نوکری کرنے کی عمر نہ تھی۔ دوسرے دفاتروں میں بھی نوکری کرنے کی طاقت نہیں تھی کافی سوچ بچار کے بعد تحریر و تصنیف کا خیال پیدا ہوا!

اگر بانس کے ٹکڑے میں چھید کر دیا جائے۔ تو اس میں پانی نہیں ٹھہر سکتا اس میں جذب کی طاقت زائل ہو جاتی ہے۔ اس سے دُنیا کا کوئی کام نہیں چلتا۔ مگر منہ سے پھونکنے پر سنت میں بانسری بن جاتی ہے۔ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ دُنیا کے کسی کام میں جس بد نصیب کی عقل کام نہیں دیتی۔ وہ ضرور ہی اچھی کتابیں لکھ سکتا ہے۔ اسی حوصلے سے میں نے پہلے ایک ڈرامہ یا تمثیل لکھا۔ لوگوں نے اُسے خوب پسند کیا۔ وہ اسٹیج پر کھیلا بھی گیا!

اچانک ہی اپنی تعریف ہوتے دیکھ کر ایسا چسکا پڑا۔ کہ اب اس کام کو چھوڑنا میرے لئے مشکل ہی نہیں۔ بلکہ ناممکن ہو گیا۔ دن بھر بے قرار فکر مند چہرہ لئے

ہوئے سر جھکائے میز پہ لکھتا رہتا!

محبت اور حیا سے ہنستی ہوئی سروج نے آکر کہا۔ "نہانے نہ چلوگے"!

مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے میرے دماغ پر کسی نے پتھر رکھ دیا ہو۔ تمام خیالات منتشر ہو گئے۔ میں نے کرخت آواز میں کہا۔

"ابھی جاؤ۔ اس وقت تنگ نہ کرو"!

میری جھڑکی سُنکر لڑکی کا چہرہ ایک پھونک سے بجھے ہوئے چراغ کی طرح بجھ سا گیا۔ مجھے معلوم نہیں ہوا۔ کہ وہ غمگین ہو کر اپنا سا منہ لے کر کب وہاں سے چلی گئی!

خادمہ کو جھڑک دیتا تھا۔ نوکر کو مارنے دوڑتا تھا۔ بھیک مانگنے والا فقیر اگر زور سے گا کر بھیک مانگتا۔ تو اُسے گالی دے کر دھتکار دیتا تھا۔ گلی کے نزدیک ہی میرا کمرہ تھا۔ اگر کوئی راہ گیر مجھ سے راستہ معلوم کرنے کے لئے پوچھتا تو میں اُسے سیدھے جہنم کو جانے کیلئے کہہ دیتا تھا۔ کوئی یہ نہ سمجھتا تھا کہ میں ڈرامہ لکھ رہا ہوں۔ مگر میں بھی تو یہ نہ سوچتا تھا کہ میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے مگر اب معلوم ہوا۔ کہ اس کام میں بھی صرف تعریف ہی سے مزہ ملتا ہے۔ لکھنے سے جتنی راحت دماغ کو ہوتی ہے۔ اس کا ہزارواں حصہ بھی روپیہ دستیاب نہیں ہوتا۔ اتنی دماغ سوزی کی قیمت صرف تعریف ہی ہے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ اس وقت مجھ کو روپیہ کا اتنا خیال بھی نہ تھا۔ جتنے لڑکے میں نے سروج کے لائق سمجھے تھے۔ ان سب کی ایک ایک کر کے شادی ہو چکی تھی۔ میں نے اس طرف بھی ذرا دھیان نہیں دیا۔ بس لکھنا اور صرف لکھنا ہی میرا کام ہو گیا۔

یکایک ایک اچھا موقع میرے ہاتھ لگا۔ دیوگڑھ کے زمینداروں نے "دیوگڑھ سماچار" نامی ایک اخبار نکالا۔ اور ایڈیٹری کے لئے مجھے منتخب کیا۔ میں نے بھی اُن کی درخواست کو بخوشی تمام قبول کر لیا!

میں نے ایسے پُر زور مضامین لکھے کہ راستہ چلنے پر لوگ دور سے ہی

انگلیاں اٹھا کر اپنی جان پہچان والوں کو میرا نام بتلاتے تھے۔ میں بھی اپنے کو دوپہر کے سورج کی طرح آنکھوں کو چندھیا دینے والا سمجھتا تھا۔ اب دماغ میں رفتہ رفتہ غرور پیدا ہونے لگا تھا۔

دیوگڑھ سے کچھ ہی فاصلے پر سنگھ گڑھ تھا۔ دونوں گاؤں کے زمینداروں میں آپس میں پشتوں سے لاگ جھپٹ تھی۔ پہلے بات بات میں دونوں پارٹیوں کے آدمی لاٹھیوں کی مار کرنے لگے۔ اسی وقت مجسٹریٹ نے فریقین کے مچلکے لے لئے۔ اسی وجہ سے لاٹھی چلانا بند ہو گیا۔ مگر طرفین میں سے ایک طرف والوں نے مجھ جیسے معمولی انسان کو تحریری لاٹھی چلانے کی جگہ مقرر کیا۔ سبھی کہتے ہیں کہ میں نے اُن کی عزت کی حفاظت کی ہے۔

میرے آتشی مضامین کے شعلوں کے مقابل سنگھ گڑھ کے لوگوں کو سر اُٹھانا مشکل ہو گیا۔ اُن کے تمام خاندان و قدیم اور گذشتہ بزرگوں کی تاریخوں کو میں نے شروع سے آخیر تک بڑی بے عزتی کے ساتھ دوہرایا۔

میں ان وقتوں بڑے آرام سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ جسم بھی دوبارہ فربہ ہونے لگا تھا۔ سنگھ گڑھ کے رہنے والے بزرگوں کی طرف اشارہ کر سکے میں ایک سے ایک بڑھ کر دل کو زخمی کرنے والا تحریر کا تیر چھوڑتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت میری زندگی بڑی خوشی سے گذرتی تھی۔

آخیر میں سنگھ گڑھ سے بھی ایک ویسا ہی چٹکیلا اخبار نکلا۔ یہ کوئی بات چھپا کر نہ کہتا تھا۔ وہ ایسے حوصلے کے ساتھ صاف عام فہم زبان میں گالی دیتا کہ اخباری حروف تک آنکھوں کے آگے چلانے لگتے تھے۔ اسی وجہ سے دونوں گاؤں کے لوگ اُسکی بات کو اچھی طرح صاف صاف سمجھ لیتے تھے۔

لیکن میں اپنے پرانے تجربے کے مطابق ایسے مزے میں ایسی چالاکی کے ساتھ دشمنوں پر حملہ کرتا تھا کہ کسی کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ میرے مضمون کا مطلب کیا ہے۔

نتیجہ یہ ہؤا: کہ میری فتح ہونے پر بھی لوگ سمجھتے تھے۔ کہ میں شکست کھا گیا ہوں۔ دوسرا کوئی ذریعہ نہ دیکھ کر میں نے ایک مکمل لیکچر لکھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہؤا کہ میں نے بڑی غلطی کی۔ جو چیز دراصل اچھی ہے اس کی ہنسی اُڑانا جتنا آسان ہے۔ ویسا میری چیز کی ہنسی اُڑانا نہیں ہے میرے اس لیکچر کا اثر وہی ہؤا۔ جو چاند پر تھوکنے سے ہوتا ہے؛

اب میرے مالک بھی پہلے کی طرح خوش خوش نظر نہ آتے تھے۔ سبھا سوسائٹی میں بھی اب ویسی عزت نہیں ہوتی تھی۔ راستے میں بھی اسطرح عزت کے ساتھ لوگ مجھے نہیں ملتے تھے۔ جہاں تک کہ آج کل مجھے دیکھ کر چند اشخاص مذاق اُڑاتے تھے۔ دنوں کے پھیر سے آج میرے احسانات بھی لوگ بھول سے گئے تھے۔ مجھے معلوم ہؤا۔ میں ایک دیا سلائی کی طرح دم بھر میں آخیر تک جل گیا ہوں؛

اب میں ایسا بے حوصلہ ہو گیا۔ کہ ہزار کوشش کرنے پر بھی ایک سطر نہیں لکھ سکتا۔ یہ خیال ہونے لگا۔ کہ اب زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ زندگی میں کوئی مسرت ہی نہیں؛

سروج آج کل مجھ سے ڈرنے لگی۔ بغیر بلائے میرے پاس آنے کا اُسے حوصلہ نہ ہوتا تھا اب اس کی یہ حالت ہو گئی۔ کہ پتا کی نسبت مٹی کے کھلونا کو بہت اچھا ساتھی سمجھتی تھی:

ایک دن کیا دیکھا۔ کہ سنگ گرٹھ سماچار" زمینداروں کو چھوڑ کر مجھ پر ہی سوار ہو رہا ہے۔ مجھے اشارہ کر کے اس نے بہت بُری بُری باتیں لکھیں۔ میرے کئی دوست ایک ایک کر کے ہنستے ہوئے آئے۔ اور مجھے وہ اخبار پڑھ کر سنا گئے بعض نے کہا اس کا مضمون چاہے کیسا ہی ہو۔ مگر الفاظ مزے دار ہیں۔ پڑھنے سے یہ صاف معلوم ہو جاتا تھا۔ کہ گالیاں دی گئی ہیں۔ دن بھر میں نے بیسیوں آدمیوں سے یہی ایک بات سُنی؛

میرے مکان کے سامنے ہی ایک چھوٹا سا باغ تھا دل بے حد اُداس ہو نیکی

وجہ سے شام کو اکیلا ٹہل رہا تھا۔ پرندے گھونسلوں میں لوٹ آئے تھے۔ اور خاموش بیٹھے تھے؛

میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا۔ کہ سنگھ گرڈہ سماچار" کو کیا جواب دیا جائے سیدھی طرح سے لکھنے میں ایک بڑی مشکل یہ ہوتی تھی۔ کہ سب لوگ سمجھ نہیں سکتے تھے۔ مجھے دار زبان آسان کی نسبت زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے اس لئے میں وچار کر رہا تھا۔ سب کو منہ توڑ جواب دوں گا۔ اور یوں ہی چپ چاپ اپنی شکست کو تسلیم نہ کروں گا؛

اُسی وقت شام کے اندھیرے میں ایک سریلی آواز کانوں میں آئی۔ اُس کے بعد ہی میرے ہاتھوں میں ایک نازک چھوٹا سا گرم ہاتھ دیا۔ میں اتنا اداس تھا کہ اس آواز اور چھونے پر بھی اپنی لڑکی کو نہ پہچان سکا؛

اُس نے نزدیک آ کے آہستہ سے پکارا؛

"بابوجی!"

کچھ جواب نہ پا کر اُس نے آہستہ سے میرے دائیں ہاتھ کو اٹھا کر اپنے نازک رخساروں پر رکھ لیا۔ پھر آہستہ آہستہ گھر کے اندر چلی گئی؛

بہت دنوں سے سروج نے مجھے اسی طرح نہیں پکارا تھا۔ اور اپنی خواہش سے آ کر اس طرح پیار نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے آج اس کی پرکشش محبت کی وجہ سے اچانک میرا دل بے قرار ہو اُٹھا؛

تھوڑی دیر کے بعد گھر میں آ کر میں نے دیکھا۔ سروج پلنگ پر پڑی ہوئی ہے۔ بخار سے اسکا جسم سست اور گرم ہو رہا ہے آنکھیں نیم وا ہیں۔ وہ شام کے گرے ہوئے پھولوں کی طرح مرجھائی پڑی ہے؛

سر پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ بہت گرم تھا بسانس بھی گرم تھا۔ ماتھے کی رگیں بھی تنی ہوئی تھیں۔ سمجھ گیا کہ سروج بیماری کی تکلیف سے دکھی ہو کر بے رحم والد کے پیار سے دل کو ٹھنڈا کرنے لگی تھی۔ لیکن والد اس وقت "دلبو گرڈہ سماچار"

میں ایک بڑا سخت مضمون شائع کرنے کی کوشش میں اُلجھا ہوا تھا۔

میں اسکے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے اور کچھ نہ کہہ کر اپنے بخار سے تپ رہے ہاتھوں میں میرا ہاتھ رکھ لیا۔ اور اسی پر اپنا چہرہ رکھ کر خاموش پڑی رہی!

میں نے اسی وقت دیو گڑھ سماچار اور سنگھ گڑھ سماچار کی تمام کاپیاں جلا ڈالیں کوئی جواب نہ لکھا۔ مجھے اس سے پیشتر فتح حاصل کرنے میں کبھی اتنی راحت نہیں ملی تھی جتنی کہ آج اس شکست سے:

سروج کی والدہ کا جب دیہانت ہوا تھا۔ تب سروج کو میں نے اپنی گود میں سہارا دیا تھا۔ اور آج اسی کی سوتیلی ماں "ایڈیٹری" کو قتل کرکے پھر اُسے چھاتی سے لگاتا ہوں:

انسپکٹر

مجھے گاؤں چھوڑنا پڑا۔ کیوں؟ اس کے متعلق میں صرف چند الفاظ ہی کہونگا:

میں ایک اچھے قصبے میں ڈاکٹر تھا۔ پولیس چوکی سٹیشن کے عین مقابل میرا مکان تھا۔ جتنی دشمنی مجھ سے اور ملک الموت سے تھی۔ اس سے کئی گنا زیادہ دوستی انسپکٹر پولیس سے تھی۔ نہ نارائن کی جوڑی سے جو بھلائی دُنیا کی ہو سکتی ہے۔ اس کو میں بخوبی جانتا تھا۔ جیسے زیور سے کپڑے کی اور کپڑے سے زیور کی خوبصورتی ہوتی ہے۔ ویسے ہی اس حالت میں مجھ سے پولیس انسپکٹر کی

اور میری انسپکٹر پولیس سے بھلائی ہونے لگی۔ ہاتھ کو ہاتھ پہچانتا ہے۔

اسی لئے زمانہ حال کے اصول کے مطابق ہم دونوں کی دوستی تھی۔ اُن کے مکان میں ان کی ایک رشتہ دار لڑکی۔ رہتی تھی۔ اسکا اور کوئی نہ تھا۔ انسپکٹر صاحب اس کے ساتھ شادی کرنے کیلئے مجھے روزانہ مجبور کیا کرتے تھے؛

میری ایک لڑکی تھی۔ مجھے وہ بہت پیاری تھی۔ میں نے اس کا نام چونی رکھا تھا۔ اس کی ماں دوسری دنیا میں چلی گئی تھی۔ اپنی پیاری بچی سوتیلی ماں کو کیسے سونپ سکتا تھا۔ ہر سال کئی دن مقرر ہوتے۔ مگر سب فضول۔ میری آنکھوں کے سامنے کئی شادیاں ہوئیں۔ میں خود بہت سی پارٹیوں میں شامل ہوا مگر خود جوں کا توں ہی رہا؛

چونی بارہ سال کی ہو گئی۔ تیرواں شروع ہوا۔ میرا خیال تھا۔ کہ میں جلدی ہی اتنا روپیہ پیدا کر لوں گا۔ جس سے کسی اچھے بڑے گھر کی لڑکی کی شادی کر سکوں گا۔ اس کام کے بعد دوسرے اچھے کام کی تیاری شروع کر دونگا؛

میں انہی خیالات میں متغرق تھا کہ منشی گنج کے کیدار ناتھ اندر داخل ہوئے اور چٹائی پر میرے پاؤں کے قریب بیٹھ کر رونے لگے۔ میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ ان کی بیوہ لڑکی یکایک کل شب کو راہی ملک عدم ہو گئی ہے۔ اور ان کے کسی دشمن نے انسپکٹر صاحب کو ایک خفیہ چٹھی لکھی ہے۔ کہ لڑکی حاملہ تھی۔ اس کا حمل گراتے ہوئے اسکی جان نکل گئی۔ ہے۔ اور اس وقت پولیس انہیں بہت تنگ کر رہی ہے۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کیلئے شفاخانہ میں پہنچایا چاہتی ہے؛

ایک لڑکی کی موت دوسرے یہ مصیبت۔ کیدار ناتھ کیلئے یہ دونوں باتیں ناقابل برداشت ہیں۔ میں ڈاکٹر بھی ہوں۔ اور انسپکٹر صاحب کا دوست بھی اس لئے وہ میری امداد کیلئے حاضر ہوا ہے!

دولت جیب چاہتی ہے۔ اسی طرح کبھی صدر پھاٹک اور کبھی کھڑکی کے

راستے آجاتی ہے۔ میں نے سر ہلا کر کہا۔

"معاملہ بڑا بے ڈھب ہے اور پھر یہ پولیس والے دوست ہیں کس کے؟
اسی طرح کی اور بھی کئی قسم کی باتیں بنائیں۔ جنہیں سُنکر بوڑھا کدار ناتھ
زار و قطار رونے لگا۔ اس کے آنسوؤں کی روانی موسلا دھار بارش
سے بھی زیادہ تیز تھی؛

خلاصہ کہنے کے لئے ضرورت نہیں۔ مگر لڑکی کی لاش کو صحیح و سالم جلانے
کے لئے کدار ناتھ کو بالکل مفلس ہونا پڑا۔ اس وقت چھنی کمرہ میں داخل ہوئی
اور سوال کیا۔

"بالو جی! وہ بوڑھا تم سے پاؤں پکڑے اسطرح کیوں رو رہا تھا"؟
میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔ "جا جا! تجھے کو ان باتوں سے کیا مطلب؟
روپیہ مل جانے کی وجہ سے ایک اچھے گھرانے میں شادی کا انتظام ہو گیا
لڑکا پہلے ہی تلاش کر لیا گیا تھا۔ اب شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ صرف
ایک لڑکی تھی اور کوئی بچہ تو تھا ہی نہیں۔ دھوم دھام میں کچھہ کسر باقی نہ
رکھی۔ کوئی عورت تو تھی نہیں۔ پڑوسنوں نے خاص کر انسپکٹر صاحب کی
بیوی نے بہت مدد کی۔ اور جسے میں نے روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کا محتاج بنا
دیا تھا۔ اس کدار ناتھ نے بھی بہت کام کیا؛

شادی کے دن شب کے تین بجے چھنی کی طبیعت بہت خراب ہوئی۔
اُسے ہیضہ ہو گیا۔ بیماری آہستہ آہستہ خطرناک صورت اختیار کر گئی۔
بہت محنت کرنے کے بعد بے فائدہ دواؤں کی شیشیاں زمین پر پھینک
کر میں کدار ناتھ کے پاس دوڑا گیا۔ جاتے ہی اس کے پاؤں پر گر پڑا!
اور اُسے کہا۔

"معاف کرو بھائی! مجھہ گنہگار کو۔ معاف کرو۔ میری صرف ایک ہی
لڑکی ہے"!

کدارناتھ مجھے اس طرح آتے اور پاؤں پکڑتے دیکھ کر گھبرا گیا اور بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ یہ کیا کرتے ہیں۔ مجھ پر آپ نے بڑا بھاری احسان کیا تھا۔ آپ میرے پاؤں کو ہاتھ نہ لگائیں"

بغیر کسی جرم کے آپ کو برباد کرنے کی وجہ سے آج میری لڑکی مر رہی ہے اس وقت میرے دماغ میں کچھ فتور سا آگیا تھا۔ میں نے سب لوگوں کے سامنے روتے ہوئے چلا چلا کر کہنا شروع کیا۔ بھائیو! میں نے اس بھلے آدمی کو بالکل برباد کر دیا تھا۔ میں اس جرم کو تسلیم کرتا ہوں۔ اور سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ ایشور میری لڑکی کو بچائیں۔

اب میں بوڑھے کدارناتھ کی جوتیاں پکڑ کر اپنے سر پر مارنے لگا۔ کدارناتھ نے جلدی سے میرے ہاتھ سے جوتا چھین لیا۔

دوسرے دن دس بجے چھوٹی اس دنیا سے چل بسی۔

اسکے دوسرے دن انسپکٹر صاحب نے کہا۔

"اب کس بات کی دیر ہے؟ شادی کر لو۔ بغیر شادی کے تمہارا گذارہ نہیں ہو سکتا۔"

انسان کو اتنی تکلیف، رنج و غم اٹھانے کے بعد شیطان کو بھی یہ جرأت نہیں ہوتی کہ اس کو یہ الفاظ آکر کہے۔ مگر کئی معاملات میں میں انسپکٹر صاحب کو ایسی انسانیت کا آئینہ دکھا چکا تھا۔ کہ اب کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ انسپکٹر نے اس دن میرے چھوری گھونپ کر میری بے عزتی کی۔

دل کی حالت چاہے کسی طرح کی بھی ہو۔ مگر کرم پھر بھی گھومتا ہی رہتا ہے۔ میرا بھی کھانا پینا، سونا، جاگنا، چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا سب معمول ہوتا رہا۔ روزانہ کام کاج سے فرصت پانے کے بعد جب میں تنہا بیٹھتا۔ تب وہی چھوٹی کا تیز سوال میرے کانوں میں گونج پیدا کرتا۔

بابوجی! وہ بوڑھا تمہارے پاؤں پکڑ کر کیوں اس طرح رو رہا تھا؟
میں نے غریب کدار ناتھ کے مکان کی مرمت اپنی گرہ سے کروا دی۔ اپنی خوبصورت گائے اُسے دے دی۔ اسکی جو زمین گروی پڑی ہوئی تھی۔ اسے بھی چھوڑا دیا۔
کچھ دن نئے غم کی تکلیف، رنج اور دُکھ کی وجہ سے سناٹے میں شام کے وقت شب کی ظلمت میں مجھے یہی معلوم ہوتا۔ کہ بہشت میں بھی چرنی کو اپنے باپ کے اس جہم کی وجہ سے آرام نہیں ملا۔ وہ اس بے آرامی سے گھبرا کر دل سے وہی سوال دہراتی ہے۔

"بابوجی! تم نے ایسا کیوں کیا؟"

چند دن تو ایسا ہوگیا کہ کسی غریب کی دوا کر کے اس سے قیمت لینے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔ لیکن چھوٹی لڑکی کے بیمار ہونے پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میری چرنی ہی اس تکلیف میں مبتلا ہے!

برسات میں بارش ہونے کی وجہ سے گاؤں کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہوگیا تھا۔ اس دن صبح سے ہی بارش ہو رہی تھی۔ زمیندار کے ہاں سے پیغام آیا۔ مجھے لینے کے لئے اُنہوں نے ایک بڑی اعلےٰ نسل کی خوبصورت گھوڑی بھی بھیجی۔ ملازم بار بار مجھے جلدی چلنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اس سے پیشتر اگر ایسے وقت میں مجھے کبھی باہر جانا ہوتا۔ تو چرنی چھتری لاکر مجھے دیتی تھی۔ کئی دفعہ گھڑی اور دوائیوں کا بکس پکڑا دیتی۔ اور آندھی پانی سے بچنے کے لئے بار بار تاکید کرتی تھی!

آج مجھے خود ہی چھتری تلاش کرنی پڑی۔ اور ساتھ ہی چرنی کی یاد آجانے سے آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔ رومال سے آنسو پونچھ کر دل پر پتھر رکھ کر میں باہر آیا!

کشتی تھانے کے عقب میں گھاٹ پر بندھی ہوئی تھی۔ وہاں میں نے دیکھا۔ ایک کسان لنگوٹی باندھے پانی میں کھڑا ہے۔ میں نے دریافت کیا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"جناب! کیا بتاؤں، کل رات میری لڑکی کو سانپ ڈس گیا تھا۔ اب تھانے میں رپورٹ لکھوانے آیا ہوں۔"

اس کے پاس لڑکی کی لاش بھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی دھوتی کھول کر اُسے ڈھانپ رکھا تھا۔ زمیندار کے بدمزاج ملاح نے کشتی کا سنگل کھول دیا۔ میں ایک بجے کے قریب وہاں سے لوٹ آیا۔ اس وقت بھی دیکھا کہ وہ آدمی لاش ہاتھ میں لئے وہیں کنارے پر بیٹھا ہے۔ ابھی تک اسکو انسپکٹر صاحب سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ میں نے گھر پہنچکر اسکے کھانے کیلئے کچھ بھیج دیا۔ مگر اس نے اُسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں کھانا کھانے کے بعد پھر زمیندار کے بیمار کو دوا دینے گیا۔ جب شام کو وہاں سے واپس آیا۔ تب بھی اس آدمی کو اس جگہ بیٹھے دیکھا۔ میں نے سوال کیا:

"بھائی ابھی تک بیٹھے ہو؟"

مگر وہ بالکل خاموش رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جواب تو دینا چاہتا ہے۔ مگر الفاظ گلے میں آکر رُک جاتے ہیں۔ وہ صرف میرے مُنہ کیطرف دیکھتا رہا اب مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے اس وقت ندی، گاؤں، تھانہ اور وہ آسمان کے بادلوں سے گھری ہوئی نمدار زمین سب خواب کی طرح معلوم ہو رہے ہیں۔ میں نے کئی بار سوال کو دوہرایا۔

پھر اس نے جواب دیا ـــــ "بہت دیر ہوئی۔ ایک سپاہی نے آکر دریافت کیا تھا۔ جیب میں بھی کچھ ہے؟"

"میں بہت غریب ہوں۔ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں" میں نے جواب دیا۔

"پھر یونہی بیٹھے رہو بیٹا!" یہ کہکر سپاہی رخصت ہو گیا۔

"اسی وقت سے میں یہاں بیٹھا ہوں۔"

یہ نظارہ میرے لئے نیا نہ تھا۔ تھانے میں اکثر ایسی باتیں دیکھنے میں آئی تھیں

مگر آج مجھ سے یہ نظارہ نہ دیکھا گیا۔ ایسے معلوم ہوا کہ میری چرنی کی سُریلی آواز میرے کانوں میں گونج پیدا کرتی ہوئی آسمان میں غائب ہو گئی۔ لڑکی کی موت کا رنج و غم کسان کی بجائے مجھے زیادہ ہو گیا؛

انسپکٹر صاحب بید کی کرسی پر بیٹھے ہوئے آرام سے سگار پی رہے تھے۔ آج اُن کے ایک رشتہ دار نے اپنی لڑکی کے ساتھ شادی کے لئے مجبور کیا تھا۔ پاس ہی چٹائی پر بیٹھے ہوئے وہ انسپکٹر سے بات چیت کر رہے تھے۔ میں یک دم آندھی کی طرح وہاں جا پہنچا۔ اور اونچی آواز سے کہا۔

"آپ آدمی ہیں یا جانور ؟"

یہ کہہ کر میں نے تمام دن کی کمائی کے پانچ روپے انسپکٹر صاحب کے آگے پھینک دئیے۔ اور کہا۔

"اگر روپے درکار ہیں۔ تو یہ لیجئے۔ جب فرشتہ موت آپ کو لینے آئے گا تب ساتھ لے جائیں۔ اس بیچارے کسان کو چھٹی دیجئے۔ تا کہ یہ غریب اپنی لڑکی کی لاش کو ٹھکانے تو لگائے"!

بہت سے ستائے گئے انسانوں کے آنسوؤں سے سینچ کر انسپکٹر کے ساتھ میری دوستی کی بیل جو خوب پھیلی تھی۔ وہ اس جھونکے نے جڑ سے اُکھیڑ کر نامعلوم مقام پر پھینک دی؛

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر صاحب کے پاؤں پکڑ کر میں نے اپنی بے وقوفی تسلیم کرتے ہوئے معافی مانگی مگر آخر کار مجھے اس مقام کو چھوڑنا ہی پڑا؛

ماسٹر

شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان چاروں طرف لال سرخ نظر آ رہا تھا۔ کشتی بہاؤ کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اچانک، دل میں کوئی خیال آتے ہی میں نے ملاحوں کو حکم دیا کہ کشتی کو وہاں ہی گھاٹ پر لگا دیں۔ میرا حکم سنتے ہی انہوں نے ایک بہت ہی شکستہ گھاٹ پر میری کشتی لگا دی!

شام ہو جانے کی وجہ سے ملاحوں نے کشتی کی چھت پر ہی نماز پڑھنی شروع کر دی۔ مغرب میں سرخی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ اور ملاح اپنی نماز میں مشغول تھے۔ ابھی پانی میں جو سرخ بادلوں کا سایہ پڑ رہا تھا وہ بھی آہستہ آہستہ غائب ہو گیا!

میں کشتی سے خشکی پر اترا۔ سامنے ایک ٹوٹا پھوٹا مکان (کھنڈر) کی صورت میں نظر آیا۔ جس کی کھڑکیاں اور دروازے سب ٹوٹ چکے تھے۔ اور مکان ایک طرف خمیدہ ہو گیا تھا۔ وہ مکان گھاٹ کے سامنے ہی تصور کی مورت تھا۔ گھاٹ کے ٹوٹے ہوئے ہونے سے مینڈکوں نے وہاں اپنے گھر بنا رکھے تھے۔ اور اس وقت شور مچا رہے تھے۔ اس وقت میں وہاں پر اکیلا بیٹھا ہوا خیالات میں غوطے کھانے لگا اور آخر آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اسی وقت کسی کی آواز نے چونکا دیا!

"آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟"

گھوم کر دیکھا۔ سامنے ایک معمر آدمی کھڑا تھا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ بہت دنوں سے بھوکا ہے اور غربت اس کے کپڑوں سے ٹپک رہی تھی۔ لباس بھی سادہ تھا۔ ایک دھوتی اور اس کے اُوپر لمبا کوٹ مگر بٹن ندارد۔ خیال ہوا کہ شاید وہ شخص ندی پر سیر کرنے آیا ہے اور کھانے کی بجائے ہوا سے پیٹ بھرے گا!

وہ شخص میرے نزدیک ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور میرے جواب کا انتظار کرنے لگا!

میں نے کہا۔ "میں الٰہ آباد سے آرہا ہوں"

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"کاروبار"

"کن چیزوں کا؟"

"ریشم وغیرہ کا"

"آپ کا نام......؟"

میرے دل میں کوئی شک گذرا۔ مگر میں نے اسکو اپنا غلط نام بتلا دیا!

"آپ کس واسطے یہاں آرہے ہیں؟"

"صرف سیر کرنے کی غرض سے۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے یہ جگہ بھلی لگی۔ دل میں خیال پیدا ہوا کہ چلو کچھ روز یہاں رہ لیں"

وہ کچھ حیران سا ہوگیا۔ آخر بولا ـــ "جناب میں بھی گئی برسوں سے یہاں ہی رہتا ہوں۔ مگر میری صحت میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا"

"مگر یہ تو ماننا پڑے گا۔ کہ یہاں کی آب و ہوا الٰہ آباد سے بہت ہی اچھی ہے"

"ٹھیک ہے۔ مگر آپ قیام کس جگہ کریں گے؟"

میں نے اُس ٹوٹے ہوئے مکان کی طرف اشارہ کیا "کہ اُس مکان میں"

اُس کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا مجھے کوئی خفیہ خزانہ اس گھر میں مل گیا ہے۔ اُس

نے اور کوئی سوال نہ کیا۔ مگر مجھے ایک لمبا چوڑا قصہ سنانا شروع کر دیا۔ جو کہ آج سے کئی برس پہلے اس جگہ ہی واقعہ ہوا ہے!

اس کی باتوں سے معلوم ہوا۔ کہ وہ اس جگہ قریب کے گاؤں میں سکول ماسٹر ہے۔ دبلا ہونے کے باوجود بھی اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور چہرے سے نور برس رہا تھا!

ملاح نماز وغیرہ سے فراغت پا کر کھانا بنانے میں مشغول تھے۔ اور وہ کھنڈر اندھیرے میں ڈراؤنا سا معلوم ہوتا تھا۔

ماسٹر صاحب بولے — "میں پہلے لکھنؤ میں ایک سکول میں ماسٹر تھا۔ مگر میری تبدیلی یہاں کر دی گئی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مجھے معلوم ہوا کہ اُس مکان میں لالہ بدری ناتھ سیٹھ عرصہ پندرہ سال سے رہ رہا تھا وہ تعلیم یافتہ تھے۔ ایشور نے دولت خوب دی ہوئی تھی چاروں طرف خوشی ہی خوشی نظر آ رہی تھی۔ نوکروں کی کمی نہ تھی!

تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ لالہ بدری ناتھ نئی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ پُرانی اور دقیانوسی باتوں سے ہمیشہ اعتراض کرتے تھے بڑی بڑی سوسائٹیوں (ں) میں اُن کی پہنچ تھی۔ لالہ بدری ناتھ شادی شدہ تھے۔ عورت بڑی خوبصورت تھی۔ اُن کی زندگی عیش سے گزر رہی تھی!

بدری ناتھ کی بیوی کو بنارسی ساڑھی اور زیوروں کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر دم انہیں خیالات میں رہتی تھی۔ کہ زیور ہی اکٹھے کرتی رہوں نتیجہ کہ اپنے خاوند کی محبت سے محروم رہی۔ کیونکہ اُسکی ہر خواہش جلد ہی پوری ہو جاتی تھی۔ لالہ بدری ناتھ نے بھی کبھی اس بات کا خیال نہ کیا۔ وہ بہت ہی سیدھے سادھے آدمی تھے۔ مالتی نے اپنے خاوند کو زیوروں اور کپڑوں کی پیدا کرنے والی مشین سمجھ رکھا تھا!

سیٹھ بدری ناتھ کا گھر علی گڑھ میں تھا۔ مگر کاروبار یہاں رہتا۔ کا،

خاندان لالہ بدری ناتھ، دو چھوٹے بھائی اور ایک بوڑھے چچا پر مشتمل تھا۔ شادی کے بعد فوراً ہی مالتی کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

مالتی سنجیدہ مزاج تھی۔ زیادہ بات چیت نہ کرتی تھی۔ وہ تمام دن گھر پر ہی رہا کرتی تھی۔ ہمسایوں سے بھی زیادہ بے تکلفی نہ تھی۔ صرف مطلب کی بات ہرا دیتا اور اعلیٰ چیزوں کو قرینے سے اور سنبھال کر رکھتی تھی۔ خاوند کی محبت کو چھوڑ کر اُس نے جو سرمایہ جمع کر رکھا تھا۔ خوبصورتی دن بدن بڑھ رہی تھی لوگ حیران تھے۔ کہ تیس برس کی ہونے پر بھی مالتی بمشکل اٹھارہ انیس سال کی معلوم ہوتی ہے۔

جن کا دل برف کی طرح سرد ہے۔ اور جن کے دل میں محبت کی جلن نہیں ہے۔ وہ دل زیادہ دیر تک تازہ رہتا ہے۔

اتنا روپیہ ہونے کے باوجود بھی مالتی کی گود خالی رہی۔ گویا کہ بھگوان نے مالتی کو ایسی چیز نہ دی تھی۔ جس کی کہ وہ اپنے لوہے کے صندوقوں میں رکھے ہوئے جواہرات سے زیادہ قدر کرتی۔ اور جو کہ اسکے برف جیسے ٹھنڈے دل کو محبت کی گرمی پہنچا کر پگھلا دیتی۔ اور دل میں محبت کے شعلے پیدا کر دیتی۔

مالتی جسم کی مضبوط تھی۔ گھر کا سب کام خود کرتی تھی۔ اُس نے زیادہ نوکر نہ رکھے ہوئے تھے۔ سب کام وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔ اُس کو کسی کا فکر نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ کسی سے محبت کرتی تھی۔ اسے اپنے پتی سے بھی کوئی خاص محبت نہ تھی۔ وہ تو صرف روپیہ جمع کرنا ہی --- جانتی تھی۔ اس لئے اُس کو خوشی غمی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

لالہ بدری ناتھ تو صرف مالتی کے صندوق زیورات سے ہی بھرا جانتا تھا اور اس کے دل کا صندوق محبت سے خالی رہا۔

اچانک ہی پاس کی جھاڑیوں میں گیدڑوں کے چلانے کی آواز آئی اور کہانی ... اپنے لیمپ کیلئے ٹوٹ گیا۔ اور اس وقت ایسا معلوم ہوا۔ جیسا کہ وہ

ماسٹر صاحب سے کہانی سُنکہ بدری ناتھ سے ٹھٹھا کر رہے ہیں۔ آخر جب گیدڑ چپ ہو گئے تو ماسٹر صاحب پھر بولے۔۔

لالہ بدری ناتھ کا وسیع کاروبار یکایک بند ہو گیا۔ وجہ کیا تھی۔ مجھے معلوم نہ ہو سکی۔ صرف اتنا ہی سُنا۔ کہ بازار کا دینا جلدی نہ دے سکے۔ اگر اس وقت کچھ پاس ہوتا۔ تو وہ دو چار روز اور گذار سکتے تھے۔ اور کام بند نہ ہوتا؛

روپے کا بندوبست نہ ہو سکا۔ اُس نے وہاں کے مہاجنوں سے سود پر روپیہ لینا بھی مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے کہ ساہوکاروں اور عوام کی نظروں سے عزت جاتی رہے گی؛

اس واسطے بدری ناتھ کو خیال آیا کہ کسی دوسری جگہ سے کچھ قرض لینا چاہیئے۔ پھر خیال آیا کہ اس کے واسطے جائداد کی ضرورت ہے آخر وقت کو ضائع نہ کرتے ہوئے اُن کو زیورات کا خیال آیا اور وہ سیدھا مالتی کے پاس گیا۔ مگر دل میں ڈر رہا تھا۔ کہ شائد ناراض نہ ہو جائے۔ بات کرتے اس کا دل کانپتا تھا؛

آخر دل کو مضبوط کر کے مالتی کو اپنی ضرورت کہی۔ اُسکی آواز کانپ رہی تھی، مگر جب مالتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو بدری ناتھ کے دل پر بڑی چوٹ لگی۔ وہ دل کے درد کو دبا گیا؛

آخر بدری ناتھ نے زیوروں کا خیال چھوڑ دیا۔ اور روپوؤں کے بندوبست کیلئے علی گڑھ روانہ ہو گیا؛

مالتی نے مشورے کے واسطے اپنے منیم کو بلایا۔ منیم صاحب مالتی کے دُور کے رشتہ میں بھائی لگتے تھے۔ اور سیٹھ جی کے پاس منیمی کا کام کرتے تھے۔ دراصل منیم صاحب کم پڑھے تھے۔ وہ صرف رشتہ داری کے زور پر تنخواہ لیتے تھے؛

مالتی نے سب کچھ کہہ کر پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟!

منیم صاحب بولے ــــ "معاملہ خطرناک ہے۔ اگر زیورات چلے گئے تو پھر یہ واپس نہ آسکیں گے"!

مالتی کو جب اس بات کا خیال آیا۔ کہ میرے تمام زیورات کاروبار کی بھٹی میں ڈال دیے جائینگے۔ تو اسکا دل کانپ اٹھا۔ کیونکہ اس کو صرف زیورات سے ہی محبت تھی۔ پھر بولی ــــ "تو کیا کیا جائے"؟

منیم صاحب کا نام دولت رام تھا۔ آخر وہ بولے ــــ

"زیورات کو لے کر اپنے والدین کے پاس چلے جاؤ۔ وہاں محفوظ رہینگے"!

دولت رام کو یقین ہو گیا تھا۔ کہ ایسا کرنے سے بہت سا زیور میرے ہاتھ لگے گا!

مجبور کرنے پر مالتی راضی ہو گئی!

فروری کا مہینہ تھا۔ شام کے وقت ایک کشتی گھاٹ پر لگی۔ دوسری صبح بہت ہی تڑکے ایک موٹی چادر اوڑھ کر مالتی کشتی پر آئی۔ منیم بھی ساتھ ہی تھا بولا ــــ "مالتی لاؤ زیورات کی گٹھڑی مجھے دے دو"!

ملاحوں نے کشتی کو چلانا شروع کر دیا۔ مالتی نے تمام زیورات پہن لئے کیونکہ وہ جانتی تھی۔ کہ اس طرح زیورات حفاظت میں رہیں گے۔ اور بغیر قتل کوئی زیور نہیں لے جا سکتا!

کشتی میں زیورات کی گٹھڑی نہ دیکھ کر دولت رام کو بڑی حیرانگی ہوئی اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ مالتی زیورات کو پہنے ہوئے ہے!

دولت رام بڑے منیم کو لکھ کر دے آئے تھے کہ وہ مالتی کو میکے چھوڑنے جا رہے ہیں۔ بڑا منیم قدیمی نوکر تھا۔ بدری کے باپ کے وقت سے یہاں کام کر رہا تھا۔ وفادار تھا۔ دولت رام کی طرح نمک حرام نہ تھا۔ بہت سٹپٹایا۔ آخر ایک خط بدری ناتھ کو لکھا۔ بدری ناتھ کو معلوم ہو گیا۔ کہ عورت کو آزادی دینا مرد کی سب سے بڑی بے وقوفی ہے!

بدری ناتھ نے مالتی کے دلی خیالات کو بھانپ لیا۔ دل پر گہری چوٹ لگی۔اس نے دل میں کہا کہ ــــ اتنا نقصان ہونے پر بھی میں نے زیورات کو ہاتھ نہیں لگایا اور یہاں چلا آیا مگر افسوس کہ اس پر بھی مالتی کو اعتبار نہ آیا۔افسوس کہ اس نے مجھ کو نہ پہچانا!

بدری ناتھ نے صبر کر لیا اور کہا ــــ کہ اگر مالتی کی ایسی ہی مرضی ہے تو ہونے دو۔ میں اپنا فرض ادا کرتا رہوں گا۔ اور اس بات کی قسم کھالی کہ وہ عورت کے ساتھ کسی قسم کی بات نہ کریگا۔ اور نہ ہی اسے کوئی خط لکھا۔

دو ہفتوں کے بعد لالہ بدری ناتھ روپیہ وغیرہ اکٹھا کر کے لائے اور تکلیف سے نجات حاصل کر کے گاؤں واپس لوٹے۔ آنکا خیال تھا کہ مالتی اب تک واپس آگئی ہوگی۔انہیں خیالات میں وہ گھر میں داخل ہوا۔مگر دروازہ کو بند پایا۔قفل توڑ ڈالا۔اندر کی حالت دیکھ کر بدری ناتھ گھبرا گیا۔چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی دکھائی دی۔گھر سونا پڑا تھا۔ ایک کونے میں لوہے کا صندوق کھلا مگر خالی پڑا ہوا تھا۔دل پر گہری چوٹ لگی۔ سوچنے لگا ــــ یہ دنیا بھی کیا عجیب ہے۔محبت اور کاروبار بھی فضول ہیں۔ہم اس دنیا کے پنجرے کی ہر ایک سلاخ پر اپنی جان دیتے ہیں۔مگر اس میں چڑیا نہیں ہے وہ رکھنے پر بھی اس میں نہیں رہنی ہے۔ دنیا فضول نظر آنے لگی۔اور دل تھام کر بیٹھ گئے!

مالتی کو لانے کے لئے کوشش کرنا بدری ناتھ نے فضول جانا۔اور دل میں سوچا۔اگر اس کا دل چاہا تو وہ خود آجائے گی۔ بوڑھے منیم نے آکر کہا

"اس طرح چپ رہنے سے کیا ہوگا۔مالتی کی خبر تو لینی چاہیئے"!

آدمی بھیجا گیا۔ مگر خبر آئی کہ نہ مالتی اور نہ ہی دولت رام گھر آیا ہے چاروں طرف ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ ندی کے کنارے کنارے طرح طرح کے سوالات کرتے ہوئے لوگ تلاش میں لگ گئے۔ دولت رام کے واسطے پولیس میں

خبر دے دی گئی۔ لیکن بے سود..... یہ کوئی نہ معلوم کر سکا۔ کہ کس کشتی میں سوار ہوئے تھے۔ اس کشتی کا ملاح کون تھا؟

آخر بہت تلاش کے بعد کوئی پتہ نہ چل سکا۔ تو بدری ناتھ غیر آباد گھر میں واپس آ گئے؟

جنم اشٹمی کا دن تھا۔ برسات کی جھڑی صبح ہی سے لگ گئی تھی۔ بوندا باندی آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ گاؤں کے مندروں میں گانا بجانا ہو رہا تھا بہت دور سے لوگ یہاں جمع ہو رہے تھے۔ اسی وجہ سے یہاں ایک میلہ لگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کئی مندروں میں تو کیرتن بھی ہو رہا تھا۔ برسات کی وجہ سے گانوں کی آواز دھیمی ہو جاتی تھی۔ یہ جو جھروکے کے پاس ڈھیلہ دروازہ ہے اس جگہ سیٹھ جی بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ پانی کے چھینٹے، اور گانوں کی سریلی آواز گھر کے اس کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ مگر سیٹھ جی کا خیال ان سب کی طرف نہ تھا۔ دیوار پر دو عدد فوٹو لٹک رہے تھے اور ایک طرف تولیہ اور کنگھا لٹک رہا تھا۔ اور ایک طرف ساڑھی الماری میں بغیر تہ کئے رکھی تھی۔ ایک کونے میں میز پر مالتی کے ہاتھ کے لگائے ہوئے پان سوکھے پڑے تھے۔ دروازہ کے سامنے کی الماری میں خوشبودار تیل عطر، چینی کے کھلونے، تاش، صابن اور بھی کئی فینسی چیزیں بڑی صفائی سے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک میز پر وہ لیمپ بھی یونہی پڑا ہوا تھا جو کہ مالتی خود اپنے ہاتھ سے جلایا کرتی تھی۔ ان سب چیزوں کو دیکھکر بدری ناتھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور اس طرح بڑبڑانے لگا۔ "آؤ مالتی آؤ۔ اپنا لیمپ تو جلاؤ۔ اور کمرے کو روشن کرو۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر عمدہ ساڑھی پہنو۔ یہ سب چیزیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا صرف یہی چاہتا ہوں کہ ایک دفعہ آ کر پھر اس اجڑی ہوئی دنیا کو بسا کر اس میں جان ڈال دو۔"

آدھی رات گزر چکی تھی معلوم نہیں کہ کب مینہ اور گانا بند ہو گیا۔ مگر بدری ناتھ وہاں پر اسی طرح بیٹھے رہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا!

اسی وقت کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔ اور زیورات کی جھنکار بھی سنائی دی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے یہ آواز گھاٹ پر سے آ رہی ہے۔ ندی کا پانی بھی نظر نہ آتا تھا۔ بدری ناتھ اس آواز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ دل کی خواہش بڑھتی گئی!

وہ آواز آہستہ آہستہ گھر کی طرف آتی ہوئی سنائی دی۔ اور گھر کے سامنے آ کر رک گئی۔ چوکیدار دروازہ بند کر کے ناچ وغیرہ دیکھنے چلا گیا تھا!

ایسا معلوم ہوا۔ کہ کوئی دروازہ کو کھٹکھٹا رہا ہے۔ اور زیورات کی جھنکار بھی سنائی دے رہی تھی۔ گویا کہ کوئی زیورات سے دروازہ کو کھٹکھٹا رہا ہے!

بدری ناتھ سے اب نہ رہا گیا۔ اندھیرے میں ہی ٹٹولتے ہوئے وہ دروازہ کے پاس آ گئے۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اور وہ دروازہ کو زور سے جب کھولنے لگا۔ تو اس کی نیند کھل گئی۔ معلوم ہوا۔ کہ میں نیند میں ہی یہاں تک آ گیا ہوں۔ تمام جسم پسینہ پسینہ ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے ہو گئے۔ اور دل کی دھڑکن زوروں پر۔ نیند کھلنے پر بدری ناتھ نے دیکھا کہ وہاں پر کچھ نہیں تھا۔ صرف موسلا دھار بارش اور گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی!

گویہ سب شروع سے آخر تک خواب تھا۔ مگر بدری ناتھ کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ دنیا کی کوئی قیمتی چیز کھو بیٹھا ہے۔ پانی کے گرنے کے ساتھ ہی دور کوئی گا رہا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ یہ جاگنا ہی خواب ہے۔ اور یہ دنیا ہی جھوٹ ہے!

دوسرے دن بھی ناچ وغیرہ تھا۔ دربان چھٹی لے گیا تھا۔ اور سیٹھ جی نے اس کو حکم دیا تھا۔ کہ آج رات بھر دروازہ بند نہ ہو!

دربان نے عرض کی ـــــ "حضور، ناچ دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ دروازہ کھلا رکھنے سے خطرہ ہے؟

بدری ناتھ نے اس بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ دربان نے پھر کہا۔
"حضور! میں رات بھر پہرہ دونگا"
"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم جاکر ناچ دیکھو"
دربان یہ سنکر بڑا حیران ہوا۔
دوسرے دن بدری ناتھ شام کو پھر لیمپ وغیرہ بجھا کر اسی کھڑکی میں آکر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے مینڈک ٹرا رہے تھے گانے والوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔
یکایک چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ بدری ناتھ سمجھ گیا۔ کہ گذشتہ رات والا وقت آ گیا ہے۔ کل کی طرح پھر گھاٹ پر سے زیورات کی جھنکار سنائی دی۔ لیکن بدری ناتھ نے اس طرف نہ دیکھا۔ وہ ڈرے کہ کل کی طرح پھر یہ خواب ہٹ نہ جائے۔
انہوں نے اپنے دل کو مضبوط رکھنے کی کوشش کی۔ کاٹھ کے پتلے کی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے آج آواز گھاٹ پر سے آکر دروازے میں داخل ہو گئی۔ بدری ناتھ کو معلوم ہوا کہ جیسے وہ آواز سیڑھیوں سے اوپر آ رہی ہے۔
اب بدری ناتھ دل کو نہ روک سکے۔ دل میں طوفان بپا ہو گیا سانس رک گئی۔ وہ آواز اوپر کمرے کی دہلیز پر رک گئی۔ اب صرف اندر داخل ہونا باقی تھا۔
بدری ناتھ سے رہا نہ گیا۔ وہ بجلی کی طرح چلا اٹھے "عاشق" نیند ٹوٹ گئی۔ (گیارہ بج گئے؟) دیکھا کہ آواز مکان میں چاروں طرف گونج رہی ہے۔ اور باہر وہی مینڈکوں کا ٹرانا اور گانے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔
بدری ناتھ نے زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ دے مارا۔
دوسرے دن حکم ہوا۔ کہ میرے سوا رات کو گھر میں کوئی نہ ہونا چاہیئے۔ نوکروں نے سمجھا۔ کہ آج شاید سیٹھ جی رات بھر پاٹھ کریں گے۔ اس روز بدری ناتھ نے سارا دن کچھ نہ کھایا۔ یہاں تک کہ پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پیا۔

رات کو پھر اُسی جگہ آ کر سیٹھ جی بیٹھ گئے۔ آج آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ آج نومی کا دن تھا۔ چاند آج دیر سے نکلے گا۔ میلہ ختم ہو گیا تھا۔ اس واسطے ندی میں کوئی کشتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ سارا گاؤں تھکان کی وجہ سے گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ بدری ناتھ گہری سوچ میں پڑے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پہلے دنوں کی یاد ستانے لگی۔ جب کہ نئی شادی ہوئی تھی۔ اور مالتی اسوقت کیسی حسین نظر آتی تھی وہ زمانہ کتنا اچھا اور خوبصورت تھا۔ بہت دیر تک اسی طرح سوچتے رہے آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے!

تارے غائب ہو گئے۔ آسمان پر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ آج بدری ناتھ کے دلکو کچھ شانتی تھی۔ اُنکو امید تھی کہ آج ضرور اُنکی خواہش بر آئے گی!

روزمرہ کی طرح آج بھی وہ جھنکار گھاٹ کی سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی مکان کی طرف آ رہی تھی۔ بدری ناتھ آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھے رہے آواز مکان میں داخل ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آ گئی اور دروازے پر آکر کچھ لمحوں کے لئے رُک گئی!

بدری ناتھ کا کلیجہ کانپ اُٹھا۔ مگر آنکھیں بند ہی رکھیں۔ آواز دروازہ گذر کر کمرے میں پہنچ گئی۔ اور کمرے کی تمام چیزوں کے پاس سے گذر کر لحہ بھر ٹھہر کر وہ آواز بدری ناتھ کے پاس آکر رُک گئی!

اسوقت بدری ناتھ نے آنکھیں کھولدیں۔ دیکھا کہ چاند کی روشنی کمرے میں پڑ رہی ہے۔ اور سامنے ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ کھڑا ہے!

اُس ڈھانچے کی آٹھ انگلیوں میں انگوٹھیاں۔ ہتھیلیوں پر ہاتھ پھول، کلائیوں میں کڑے بازوؤں میں بازو بند۔ گلے میں ہار۔ گویا کہ تمام جسم سونے کے زیوروں سے لدا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ خوفناک اُسکی آنکھیں تھیں۔ آنکھوں میں وہی روشنی، وہی چمک، وہی خوبصورتی نظر

آ رہی تھی۔ جو کہ بدری ناتھ نے شادی کے وقت مالتی کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ یہ سب دیکھ کر بدری ناتھ کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ آنکھیں موندنے کی کوشش کی مگر نہ کر سکے۔ اور وہ مردے کی طرح ڈھانچے کی طرف دیکھتے رہتے!

اس ڈھانچہ نے بدری ناتھ کو اُنگلی سے اشارہ کر کے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ انگلیوں کی ہڈیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں!

بدری ناتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ڈھانچہ کمرہ سے باہر آیا۔ اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے پہنچا۔ اور گھاٹ کی طرف چلا۔ گھاٹ کی تمام سیڑھیاں اُتر کر وہ ڈھانچہ پانی کی طرف بڑھا چاندکی چاندنی سے ندی کا پانی چمک رہا تھا!

ڈھانچہ پانی میں اُترا۔ بدری ناتھ نے بھی پانی میں پاؤں ڈالا۔ پانی میں آتے ہی بدری ناتھ کی آنکھیں کھل گئیں۔ سامنے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ ڈھانچہ غائب تھا۔ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔ ندی کے اس پار کے پیپل کے درخت نظر آ رہے تھے۔ چاند ستارے لالہ بدری ناتھ سیٹھ کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ لالہ بدری ناتھ کا پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ گہرے پانی میں چلے گئے۔ وہ تیرنا جانتے تھے۔ بڑے اچھے تیراک تھے۔ مگر تیر نہ سکے۔ اور شاید ہمیشہ کی گہری نیند میں سو گئے!

یہاں تک واقعہ بیان کر کے ماسٹر صاحب ذرا رُک گئے۔ بہت دیر تک کچھ نہ بولے وہ بھی خاموش رہے۔ اندھیرے کی وجہ سے ماسٹر صاحب میرا چہرہ بھی نہ دیکھ سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے۔

"کیا آپ کو اس بات کا یقین نہیں آیا؟"

جواب میں میں نے پوچھا۔ "کیا آپ کو یقین ہے؟"

ماسٹر صاحب بولے۔ "نہیں! کیوں نہیں یقین کرتا۔ اس کی کئی وجوہات

ہیں۔ ایک تو یہ کہ قدرت کا کام کہانی لکھنا نہیں ہے۔ اس کو اور بھی کئی کام ہیں۔ اور۔۔۔۔۔۔"

میں بات کاٹ کر بولا ــــ "میرا ہی نام سیٹھ بدری ناتھ ہے!"

ماسٹر جی نے کچھ بھی خیال نہ کرتے ہوئے کہا ــــ "تو میں نے ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا۔ آپ کی عورت کا کیا نام ہے؟"

"منی"

بیرسٹر

رام چرن نے جب پہلے پہل پنڈت بھولا ناتھ بیرسٹرایٹ لا کے یہاں نوکری کی تو اسکی عمر بارہ سال کی تھی۔ وہ رڑنا ؤ ضلع کا رہنے والا تھا۔ لمبے بال۔ بڑی بڑی آنکھیں اور رنگ چپلا سانولا تھا۔ وہ بھی برہمن کا لڑکا تھا بھولا ناتھ کے ایک سالہ بچے کو کھلانا اور دل بہلانا اس کا خاص کام تھا۔

اس بچے نے مقررہ وقت کے آنے پر رام چرن کی گود سے سکول میں اور سکول چھوڑ کر کالج میں قدم رکھا۔ کالج سے پاس ہو کر وہ منصف ہو گیا۔ رام چرن اسوقت بھی اس کا نوکر ہے!

پہلے رام چرن کا مالک یہی تھا۔ اب مالکہ بھی آگئی ہے۔ رام چرن کے گود کھلائے ہوئے مالک کا نام گوری شنکر تھا۔ گوری شنکر اور اس کی بیوی کا کام تو رام چرن کو نیابتی میں کرنا پڑتا۔ کیونکہ گوری شنکر نے جو جگہ خالی کی تھی۔ وہ اب ان کے لخت جگر نے پُر کر دی ہے۔ چند دن ہوئے گوری شنکر کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ رام چرن صرف اپنی کوشش اور اچھے سلوک سے بالکل اپنے قابو میں کر رکھا ہے؛

رام چرن اس بچے کو بڑے حوصلے کے ساتھ کھیلاتا ہے۔ نہایت چالاکی کے ساتھ دونو ہاتھوں میں لے کر اوپر اچھالتا ہے۔ اس کے منہ کے پاس منہ لے جاکر دلکش چٹکی لے کر سر ہلاتا ہے۔ اور جواب کی کوئی ضرورت نہ سمجھ کر کئی بے معنی اور عجیب وغریب سوال کرتا ہے۔ اور وہ شیر خوار بچہ رام چرن کو دیکھ کر خوشی میں پھولا نہیں سماتا؛

آخر کار جب وہ بچہ گھٹنوں کے بل چل کر بڑی ہوشیاری سے چوکھٹ کے پار جانے اور کسی شے کے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ تب رام چرن اسکی اس پیچیدہ ہوشیاری اور سوچنے کی طاقت کو دیکھ کر حیران ہوا۔ مالکہ کے پاس جاکر محبت کا اندازہ ظاہر کر کے کہا۔

"بہو! تمہارا لڑکا بڑا ہو کے یہ بیرسٹر ہوگا پانچ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پائیگا"۔

رام چرن سمجھتا تھا۔ کہ عالم میں اور کوئی بچہ اس عمر میں چوکھٹ پار کر کے ایسی ناممکن ہوشیاری کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ صرف ہونہار بچوں سے کہ لئے ایسا کرنا کچھ حیرانگی نہیں ہے؛

جب وہ لڑکھڑاتے پاؤں سے چلنے لگا۔ تب وہ نظارہ رام چرن کو بہت ہی دلکش معلوم ہوا۔ وہ بچہ جب ماتا کو ماں اور بھوا کو بوا اور رام چرن کو ننّن کہہ کر پکارنے لگا۔ تب تو رام چرن کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ ہر ایک نئے آئے گئے سے اس حیرت خیز خبر کا ذکر کرنے لگا۔ سب سے بڑھ کر حیرت کی بات یہ تھی۔ کہ

وہ بچہ ماتا کو ماں اور پتا کو ابو کہتا ہے. مگر رام چرن کو کہتا ہے چرن،
واقعہ ہی کہنا پڑے گا۔ کہ اس بچے کے دماغ میں اتنی عقل کہاں سے آ گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی عقلمند انسان کبھی بھی اس حیرت انگیز عقل کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ اگر دیتا بھی تو اس کے جج کے عہدہ پانے کی پیشین گوئی کے سلسلہ میں یہ ایک تو مکمل طور پر شک ہوتا۔

کچھ دن بعد منہ میں رسی کی لگام ڈال کر رام چرن کو گھوڑا بننا پڑا۔ پہلوان بن کر بچے کے ساتھ کشتی لڑنا پڑی۔ اس کشتی میں، ہمیشہ بچے کی فتح ہوتی۔ ان ہی دنوں میں گوری شنکر کی تبدیلی ہو گئی۔ انہیں بنارس جانا پڑا؛

وہاں ان کی قسمت سے کانشی کے راجہ کے پرائیویٹ سکریٹری کی جگہ خالی ہوئی۔ گوری شنکر کانشی کے راجہ سے کئی بار مل چکے تھے۔ ان کی ملنساری، ہوشیاری اور نیکنامی کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے وہ ان کے سرپرست تھے انہوں نے گوری شنکر کو اپنے پرائیویٹ سکریٹری کا عہدہ عطا کیا۔ گوری شنکر رام نگر میں جا کر رہنے لگے؛

گوری شنکر بنارس سے اپنے لڑکے کے لیئے ہاتھ سے چلنے والی گاڑی لے گئے تھے۔ ریشمی کمخواب کی ٹوپی۔ ہاتھوں میں سونے کے کڑے پہنا کر رام چرن اس بچے کو اسی گاڑی میں بٹھا کر صبح و شام ہوا خوری کے لیئے لے جایا کرتا تھا۔

برسات کا موسم آیا۔ گنگا بڑھنے لگی۔ آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے پودے بھی پانی میں غائب ہو گئے۔ گنگا کی گرج دور دور تک سنائی دینے لگی۔ تیزی سے بہتی ہوئی جھاگ چھوڑتی ہوئی گنگا کی تیز رفتار نے نغمے کی شکل اختیار کر لی؛

تیسرے پہر آسمان پر ابر تھا۔ لیکن بارش ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ اور تیرن کا جھنڈا اٹھا کر، گاڑی پر جھنڈا لگا کر بیٹھ گیا۔ رام چرن آہستہ آہستہ گاڑی

دھکیلتے ہوئے ندی کے کنارے پہنچا۔ ندی کے کنارے کوئی کشتی نہ تھی بیابان میں بھی کوئی انسان نہ تھا۔ دوسرے کنارے پر کاشی کے اونچے اونچے مکانوں پر غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں بادل کے اندر سے نظر آ رہی تھیں چاروں طرف سناٹا تھا۔ اس وقت بچے نے یکایک ایک طرف انگلی اٹھا کر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"چنن! پھول!!"

تھوڑی دور پانی اور کیچڑ سے پُر زمین پر ایک پھولوں کا پودا تھا۔ اس کی ایک ٹہنی میں پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ لڑکا اسی طرف دیکھ کر انگلی کا اشارہ کر رہا تھا۔ دو چار دن ہوئے رام چرن نے لکڑی کے ٹکڑوں میں پہیے لگا کر ایک چھوٹی سی گاڑی بنا دی تھی۔ اس سے باندھ کر اس گاڑی کو کھینچنے سے وہ بچہ ایسا خوش ہوا۔ کہ اس دن سے لگام پہن کر رام چرن کو گھوڑا بننا پڑا۔ پہلے تو وہ بچہ رام چرن کو گھوڑا بنا کر کھینچتا تھا۔ مگر اب پھولوں کی گاڑی کا کوچوان بنا دیا گیا!

کیچڑ میں جا کر پھول لانے کے لئے رام چرن کا دل نہ چاہتا تھا بڑی چالاکی اور جلدی سے اس نے دوسری طرف انگلی اٹھا کر بچے کو بہلانے کی نیت سے کہا۔

"دیکھو! دیکھو... وہ چڑیا... وہ اڑ گئی! ارے چڑیا آ"

آواز پیدا کرتے کرتے تیزی سے وہ گاڑی لے جانے لگا!

لیکن بڑے ہو کر جس بچے کی بیرسٹر بننے کی پیشین گوئی ہو اس بچے کو اس طرح معمولی طریقے سے بہلانے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ خاص کر وہاں کوئی دوسری آنکھوں کو اپنی طرف کھینچنے والی موجود نہ تھی۔ رام چرن جھوٹ موٹھ چڑیا دکھا کر بچے کو زیادہ دیر تک خوش نہ کر سکا!

لاچار ہو کر رام چرن نے اس بچے کو کہا۔ "اچھا تم گاڑی پر بیٹھو میں ابھی جلدی سے پھول لے کر آتا ہوں خبردار پانی کے پاس نہ جانا!

یہ کہکر گھٹنوں کے اُوپر دھوتی چڑھاکر رام چرن اس درخت کی طرف چلا۔ مگر اس نے یہ سخت غلطی کی۔ جو جاتے وقت اس بچے کو پانی کے پاس جانے سے بند کر دیا۔ بچے کا خیال پھولوں کی طرف سے ہٹ کر پانی کی طرف چلا گیا؛ اس نے دیکھا۔ کہ پانی کھلکھلا کر ہنستا ہوا رقص کرتا ہوا لہریں اُچھالتا ہوا مدو جزر پیدا کرتا ہوا تیزی سے نکل رہا ہے۔ لاکھوں بچے تالیاں بجاتے ہوئے چھپنے کی جگہ کی طرف سرعت سے بھاگے جا رہے ہیں۔

پانی کے بہنے کی اس شان سے بچے کا دل مچل اُٹھا گاڑی سے آہستہ آہستہ اُتر کر وہ پانی کے کنارے پر گیا؛

کنارے پر جھاگ کا تودا جا رہا تھا۔ بچہ جھک کر اس کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ بچے کو ایسا معلوم ہوا کہ نہ چلتا ہوا پانی اپنے شور و غل سے مجھے اپنی طرف اپنی گود میں بلا رہا ہے۔ ایک بار گنگا میں کنارے کی مٹی گرنے کی آواز پیدا ہوئی۔ مگر برساتی ندی میں ایسی کئی آوازیں پیدا ہوتی رہتی ہیں؛

رام چرن نے بہت سے پھول توڑے اور اپنی دھوتی کی جھولی میں بھر لئے درخت سے اُتر کر مسکراتا ہوا گاڑی کے پاس آکر اس نے دیکھا کہ گاڑی میں کوئی نہیں۔ گھر اکر چاروں طرف دیکھا۔ مگر کوئی بھی نظر نہ آیا؛

رام چرن کی عقل چکرا گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا بھرائی ہوئی آواز میں چلا اُٹھا ـــ

"بچہ! بچہ!!"

لیکن چنن کہکر کسی نے جواب نہ دیا کوئی بچہ کھلکھلا کر نہیں ہنسا۔ بزرگ گنگا پہلے کی طرح کھلکھلاتی ہوئی کبھی ہموار سطح آب اور اپنے ساتھ ساتھ مدو جزر لئے چلی جارہی تھی۔ جیسے وہ جانتی ہی نہیں۔ جیسے ایسا معمولی واقعہ پر دھیان دینے کی اسے منٹ کے لئے بھی فرصت نہیں۔ جیسے اُسے کسی سے سروکار ہی نہیں؛

شام ہو گئی۔ بچے کے واپس نہ آنے پر اس کی ماں گھبرا اٹھی۔ اس نے دوسرا آدمی بھیجا؛

لیمپ لئے ہوئے ایک آدمی نے گنگا کے کنارے آکر دیکھا۔ رام چرن دیوانوں کی طرح میدان میں ادھر اُدھر میرا بچہ میرا بچہ کہتا ہوا دوڑ رہا ہے۔ چلانے سے اس کا گلا بیٹھ گیا ہے؛

آخر کو گھر پہنچکر رام چرن مالکہ کے قدموں پر گر پڑا؛

بچے کی ماں اسکو بچے کے بارے میں پوچھتی ہے۔ اتنا ہی۔ وہ روتا ہے اور کہتا ہے؛

"مجھے معلوم نہیں بہو"

چاہے سب ہی دل میں سب کو یقین ہو گیا ہو۔ کہ یہ کام ندی کا ہے۔ پھر بھی بچے کی ماں کو شک ہی رہا ہے کہ رام چرن نے ہی بچے کو کہیں نہ کہیں چھپا رکھا ہے"

اس نے رام چرن کو بلا کر بہت منت سماجت کر کے کہا۔

"اگر تو میرے بچے کو میرے حوالے کر دے تو میں تمہیں منہ مانگا روپیہ دونگی"

یہ سنکر رام چرن نے اپنے سر پہ ہاتھ مارنے کے سوا کچھ نہیں کہا۔

یہ دیکھ کر مالکہ نے اسے پھٹکار دیا؛

گوری شنکر نے اپنی بیوی کے دل سے جو رام چرن کے لئے کدورت تھی دور کرنے کی ناکام سعی کرتے ہوئے کہا۔

"رام چرن ایسا آدمی نہیں۔ وہ کبھی بھی اپنے مالک کے ساتھ ایسی بے ایمانی نہ کرے گا"

"پتی دیو! اس نے زیور پہنے تھے۔ دولت کو دیکھ کر بڑے بڑے مہاتما اپنے دل پر قابو نہیں رکھ سکتے"

رام چرن اپنے گاؤں کو واپس چلا گیا۔ چاہے وہ بڈھا ہو گیا تھا۔ اور ...

اس کے ہاں بچہ پیدا نہ ہوا تھا۔ اب اس عمر میں اولاد ہونے کی اُمید نہ تھی۔ مگر قسمت کی بات کون جان سکتا ہے۔ سال کے اندر ہی اندر اسکے گھر لڑکا پیدا ہوا اور ایک ماہ بعد اسکی بیوی پرلوک سدھار گئی؛

وہ اس شیر خوار بچے کو دشمن کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس نے خیال کیا کہ یہ بچہ اُس بچے کی جگہ لینے آیا ہے۔ مالک کے اکلوتے لڑکے کو پانی میں بہاکر آپ چین سکھ بھوگنا مہا پاپ ہے۔ اگر رام چرن کی بیوہ بہن نہ ہوتی تو یہ بچہ بہت دن تک اس عالم میں نہ رہتا؛

حیرت کی بات یہی ہے کہ بچہ بھی کچھ دن بعد چوکھٹ سے گذرنا اور ہر طرح منع کرنے اور پھر نہ ماننے میں عجیب و غریب ہوشیاری دکھانے لگا۔ یہاں تک کہ اس بچے کی آواز اور رونے کی چیخیں بھی اس بچے سے ملتی جلتی تھیں۔ کبھی کبھی اس بچے کا رونا سُنکر رام چرن کا کلیجہ دھڑکنے لگتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے نہ دیکھ کر بچہ رو رہا ہے؛

رام چرن کی بہن نے اسکا نام مسخرہ رکھا تھا؛

وقت آنے پر بھوا کو بو کہنے لگا۔ اس پہلے سُنے ہوئے لفظ کو سُنکر رام چرن چونک پڑا۔ اس نے اپنے دل میں خیال کیا۔

"تب تو بچہ مجھے بھول نہیں سکا۔ یہ ضرور وہی بچہ ہے؛"

اس کے متعلق کئی زور آور ثبوت تھے۔ اس بچے کے مرنے کے اسی سال اس بچے کا جنم ہوا۔ دوسرے اس عمر میں اسکی بیوی کے ہاں بچہ پیدا ہوا یہ اسکا نہیں ہو سکتا؛

"تیسرے لڑکا بھی گھٹنوں کے بل اور لڑکھڑاتے پاؤں سے چلتا ہے۔ اور کبھوا کو بو کہتا ہے۔ جن آثار سے ہیر سرٹ ہونے کی پیشین گوئی ہو سکتی ہے وہ تمام اس میں موجود ہیں؛

... رام چرن کو ایک ... آ گئی ... [illegible]

یک دم ہی کہا۔

"واہ بہو کا دماغ" اسی وقت سمجھ گیا تھا۔ کہ بچے کو کسی نے چرا لیا ہے"

تب اسے اس بات کے لئے بڑا پشتاتاپ ہوا۔ کہ اتنے دن تک میں نے بچے کو کیوں نفرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ اسی دن سے بچے پر اس کی محبت بڑھنے لگی؛

اب سے رام چرن اپنے بچے کو امیروں کے بچے کی طرح رکھنے لگا۔ ریشمی قمیض اور کوٹ بنوا دیا۔ زری دار ٹوپی کانپور سے خرید لایا بیوی کے زیورات کے کڑے وغیرہ بنوا دئے۔ اب رام چرن خود ہی اس بچے کو کھلایا کرتا تھا۔ محلے کے کسی لڑکے کے ساتھ اسے کھیلنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ تمام لڑکے نواب زادہ کہکر اس کی ہنسی اڑاتے تھے۔ گاؤں کے لڑکوں کا یہ پاگل پن دیکھ کر رام چرن کو بہت حیرت ہوئی؛

جب پڑھنے کے لائق ہوا۔ تب رام چرن سب مکان وغیرہ بیچ کر لڑکے کے واسطے کانپور چلا گیا۔ وہاں بڑی تکلیف سے ایک نوکری تلاش کرنے پر ملی۔ پھر لڑکے کو سکول میں داخل کر دیا؛

آپ چاہے غربت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر لڑکے کے واسطے ہر طرح کا امیرانہ سامان مہیا تھا۔ اسے کھانے پینے، پہننے اور خرچ وغیرہ میں کسی قسم کی کمی یا تکلیف نہ تھی؛

اس طرح بارہ برس گذر گئے۔ لڑکا خوب دل وجان سے محنت سے پڑھنے لگا۔ دیکھنے میں بھی جسم کا فربہ اور چست وچالاک تھا۔ سانولے رنگ کا تھا۔ بال بنانے اور صفائی سے رہنے میں خاص خیال رکھتا تھا۔ قصہ کوتاہ وہ ہر طرح سے خوش مزاج خوش خلق اور شوقین تھا۔ وہ پتا کو ٹھیک پتا کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ رام چرن پتا کی طرح محبت رکھنے پر بھی نوکر کی طرح اس کی سیوا کیا کرتا تھا؛

ایک بات یہ تھی۔ کہ رام چرن نے یہ بات سب سے چھپا کر رکھی تھی۔ کہ وہ اس لڑکے کا باپ ہے یہانتک کہ وہ لڑکا بھی اس راز سے ناآشنا ہی تھا؛

جس گھر میں مسخرہ رہتا تھا۔ اس میں دس بارہ اور بھی سکول کے طالب علم رہتے تھے۔ اور اکثر دیہاتی رام چرن کی طرز رہائش پر ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ رام چرن کے موجود نہ ہونے پر وہ لڑکا بھی کبھی کبھی اس ٹھٹھے میں شامل ہو جاتا تھا۔ اس پر بھی تمام لڑکے سیدھے سادے اور محنت والے رام چرن کو پیار کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لڑکا بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ مگر فرزند کی نظر سے نہیں۔ اس محبت سے کچھ "انوگرہ" ملا ہوا تھا۔

رام چرن بہت بڑھا ہو گیا۔ اس کا مالک اس کے کام میں ہمیشہ غلطی نکالتا رہتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا جسم بھی بیکار ہو گیا ہے۔ کام میں اب اس قدر دل نہیں لگا سکتا۔ مگر جو آدمی پوری تنخواہ دیتے ہیں۔ وہ بڑھاپے کا بہانہ کیوں مانیں؛

جو روپیہ اس نے مکان کا زیور وغیرہ بیچ کر اکٹھا کیا تھا۔ وہ تمام ختم ہو گیا؛

بچہ پڑھنے لکھنے اور کھانے پینے میں کمی دیکھ کر رام چرن سے بگڑ بیٹھا؛

ایک دن رام چرن نے یکایک نوکری چھوڑ دی۔ اور لڑکے کو کچھ روپے دے کر کہا۔

"کام کی وجہ سے میں واپس جا رہا ہوں۔ جلدی لوٹ آؤنگا"؛

دوسرے دن رام چرن بنارس پہنچا۔ وہاں گوری شنکر اس وقت بھی راجہ کے پرائیویٹ سکریٹری تھے؛

گوری شنکر کے ہاں اور کوئی لڑکا بالا نہیں ہوا۔ ان کی بیوی کے دل میں ابھی تک اس بیٹے کا غم لگا ہوا تھا؛

ایک دن شام کو دفتر سے آ کر گوری شنکر آرام کر رہے تھے ماں اور بیوی اولاد

کی آرزو سے ایک سنیاسی مہاراج سے آشیرباد مول لے رہی تھی۔ اسوقت دروازے پر رام چرن نے پکارا!

"بھیاجی"

گوری شنکر نے سمجھا کہ راجہ صاحب کا کوئی آدمی ہے۔ اس لئے کہا۔

"کون ہے؟"

رام چرن اندر چلا گیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر بولا ــ

"میں ہوں رام چرن"

بڈھے کو دیکھ کر گوری شنکر کو رحم آ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"اب کہاں رہتے ہو؟ کیسے ہو؟ کیا کام کرتے ہو؟" وغیرہ وغیرہ کئی سوال کر کے اپنے ہاں دوبارہ نوکری کرنے کی پیشکش کی!

"رام چرن نے روکھی ہنسی ہنس کر کہا۔

"بہوجی کہاں ہیں؟"

گوری شنکر اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔ بہو نے پہلے کی سی محبت کے ساتھ بڈھے کو خوش آمدید نہیں کہا۔ رام چرن نے اس پر دھیان نہ دے کر ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"بہوجی! میں ہی تمہارے لڑکے کو چرا لے گیا تھا۔ نہ یہ گنگا کا کام ہے۔ اور نہ اور کسی کا۔ مجھ سے ہی یہ گناہ ہوا۔ میرا ہی یہ کام تھا"

گوری شنکر چونکے اور حیرت زدہ نگاہوں سے بڈھے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے

"کیا کہتے ہو؟ وہ کہاں ہے؟"

رام چرن نے اطمینان سے کہا۔

"وہ میرے پاس ہے میں پرسوں لے آؤنگا"

اس دن شوراتری کی چھٹی تھی۔ دفتر نہیں جانا تھا۔ صبح سے خاوند بیوی دروازہ کھولے ہوئے بیٹے کے لئے بے چین ہو رہے تھے۔ دس بجے لڑکے کو لے کر

رام چرن حاضر ہوا!

گوری شنکر کی بیوی نے کوئی سوال نہ کرتے ہوئے اُسے گلے سے لگا لیا اور اس کے جسم پر محبت بھرے لہجے میں ہاتھ پھیر کر اُلفت کی نگاہوں سے اس کا خوب صورت چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو نکل پڑے وہ پاگل سی ہوگئی۔ لڑکا بالکل تندرست اور جسم کا فربہ تھا!

بچے کا پیارا کتابی چہرہ اور شرمیلی طبیعت دیکھ کر گوری شنکر کو بھی اس سے محبت ہوگئی۔ پھر بھی انہوں نے پکا یقین نہ کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی ثبوت ؟"

"ایسے کام کا ثبوت کیا رہ سکتا ہے ؟ میری اس چوری کا مالک بھگوان ہی جانتے ہیں۔ عالم میں دوسرا کوئی نہیں جانتا"

گوری شنکر نے دل میں خیال کیا کہ ان کی بیوی نے لڑکے کو اپنا ہی سمجھ لیا ہے۔ اب ثبوت حاصل کرنے کی کوشش حاصل کرنا درست نہیں یقین کر لینا چاہیئے۔ اور اس کے بعد یہ بھی بات ہے کہ رام چرن کو ایسا لڑکا ہی کہاں سے مل سکتا ہے ؟ جو بڈھا نوکر ہے۔ بے وجہ ہی بے ایمانی کیوں کرنے لگا ؟

لڑکے سے بات چیت کرنے پر انہیں معلوم ہوا کہ وہ بچپن سے ہی رام چرن کے پاس ہے۔ وہ رام چرن کو اپنا باپ ہی سمجھتا تھا۔ مگر رام چرن نے اُسکے ساتھ کبھی بھی باپ کا برتاؤ نہیں کیا۔ اسکا برتاؤ نوکروں کی طرح ہی رہا ہے ؟

گوری شنکر نے دل سے شک کو دور کر کے کہا۔

"رام چرن! اب تو ہمارے یہاں نہیں رہ سکتا!"

رام چرن نے عاجزی سے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مالک! بوڑھاپے میں کہاں جاؤں گا ؟"

مالکن نے رحم کھا کر گوری شنکر کو متوجہ کر کے کہا۔

"رہنے دیجئے! میرا لڑکا جیتا رہے۔ میں نے اسے معاف کیا"

انصاف پسند گوری شنکر نے کہا۔

"اس نے ایسا کام کیا ہے کہ معاف نہیں کیا جاسکتا!"

رام چرن نے گوری شنکر کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا۔

"میں نے نہیں کیا جو کچھ ہوا۔ ایشور نے کیا!"

اپنا جرم ایشور کے سر لگانے کی ناکام کوشش کرتے دیکھ کر گوری شنکر کو اور بھی غصہ چڑھ گیا۔ انہوں نے کہا۔

"ایسے بے ایمان شخص کا کبھی بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا!"

رام چرن نے مالک کے پاؤں پکڑ کر کہا۔ "چور میں نہیں ہوں!"

گوری شنکر کو اور طیش آیا۔ اس نے کہا۔ "پھر کون ہے؟"

رام چرن نے عاجزی سے جواب دیا۔ "میری قسمت!"

"لیکن ایسی صفائی سے کسی شخص کو یقین نہیں ہوسکتا!" گوری شنکر نے ... مسخرہ نے جب دیکھا کہ وہ ایک راجہ کے پرائیویٹ سکریٹری کا لڑکا ہے۔ رام چرن نے چرا کر اب تک اپنا لڑکا بنا کر اسکی بے عزتی کی ہے۔ تب اسے بھی رام چرن کے ساتھ کچھ چڑ سی ہو گئی مگر پھر بھی رحم دکھانے ہوئے۔ اُسنے ماں اور باپ دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پتا جی! ماں جی!! اسے معاف کر دیجئے گھر میں نہ رہنے دیجئے۔ مگر کچھ ماہانہ تنخواہ کا انتظام کر دیجئے!"

رام چرن کو متوجہ کرکے کہا۔ "چنن! تم جاکر آرام کرو!"

اب گوری شنکر کچھ نہ کہہ سکا۔ رام چرن نے ایک بار لڑکے کا چہرہ محبت کی نگاہوں سے دیکھا۔ سب کو پرنام کیا۔ پھر باہر آکر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا!

مہینے بعد گوری شنکر نے رام چرن کو اُسکے گاؤں میں پانچ روپے بھیجے مگر وہ واپس آگئے۔ رام چرن وہاں نہیں تھا!

یدھشٹر

یدھشٹر مالی تھا۔

ایک مرد تھا اور ایک ننھی اس کی آٹھ سالہ لڑکی۔ دونو محنت کر کے پھول چنتے اور روزی کماتے۔ یہ تھا اُن کا معمول،

یدھشٹر نے تالاب سے ایک کنول کا پھول توڑا۔ بس صرف یہی ایک کنول تھا جو پالا کڑکڑاتی ہوئی ساکن کر دینے والی سردی سے بچ رہا تھا تمام تالاب خالی تھا۔ سرما میں کنول ملنا دشوار تھا،

یدھشٹر کنول توڑ کر اپنی قسمت پر نازاں تھا۔ اور اسے مہاراج کے پاس فروخت کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ اسی خواہش کو لئے ہوئے وہ محل کی جانب روانہ ہوا۔ کیونکہ اسے کامل یقین تھا۔ کہ منہ مانگی مراد پاؤں گا۔ وہ ابھی آدھا راستہ ہی طے کرنے پایا تھا۔ کہ راہ گیر نے اُسے روکا اور سوال کیا۔

"اس کنول کے پھول کا کیا لوگے؟ میں اسے مہاراج کی نذر کرنے کے لئے خریدنا چاہتا ہوں۔"

"میں اسے مہاراج کے پاس فروخت کرنے جا رہا ہوں۔ اس کی قیمت ایک ماشہ سونا ہے۔ اگر چاہو تو خرید سکتے ہو۔"

"مجھے منظور ہے۔"

یہ کہہ کر راہ گیر قیمت ادا کرنے ہی والا تھا۔ کہ اسی وقت یکایک مہاراج ننگے پاؤں ادھر سے گذر رہے۔ جو مہاراج بدھ کے درشنوں کے لئے جا رہے تھے کنول کا پھول دیکھ کر وہ بھی ٹھہر گئے۔ دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ مہاتما بدھ کی نذر کے لئے یہ بالکل مناسب اور جائز تحفہ ہے:

"کنول کے پھول کو کس قیمت پر فروخت کرنا چاہتے ہو؟"

مہاراج نے باغبان کی طرف دیکھ کر سوال کیا!

"حضور! یہ صاحب یک ماشہ سونا دے رہے ہیں"

"میں پانچ ماشہ دینے کو تیار رہوں"

"اور میں ایک تولہ" راہ گیر نے کہا۔

مالی کنول کی بڑھتی ہوئی قیمت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ شخص اس پھول کی قیمت بہت زیادہ ادا کر سکے۔ جس کے لئے یہ دونو شخص اسے خرید رہے ہیں۔ اس نے یک دم اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔ اور دولو کیطرف دیکھ کر بولا ـــــ

"میں یہ پھول بیچنا نہیں چاہتا"

دولو کی زبان سے یک دم نکلا ـــ

"کیوں؟"

"ایسے ہی ارادہ نہیں رہا"

تینوں خاموش ایک ہی جانب روانہ ہو گئے!

موسم سرما کی خنک صبح تھی۔ سرد ہوا کے جھونکے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو کو ہر طرف پھیلا رہے تھے۔ پرند ڈالیوں پر کھیل رہے تھے۔ سورج دیوتا نے ابھی تک لحاف سے منہ نہیں نکالا تھا،

حدود شہر کے باہر آموں کے گھنے اور خاموش سائے میں بھگوان بدھ آسن جمائے بیٹھے تھے۔ سیدھا سادھا ایک ایک قدم چلتا ہوا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔

بھگوان بدھ کے چہرہ سے ایک روحانی، نورانی نور ضو فشاں تھا محبت اور عقیدت کی زندہ تصویر، ایک خاص مسرت سے چمکتی ہوئی آنکھیں۔ ایسے معلوم ہوتا تھا۔ کہ صبح کے ڈھلے ہوئے شفاف آسمان سے اخترِ صبح نور پاشی کر رہا ہے۔

مہر ھشٹر کی آنکھیں اس کو دیکھ کر چندھیا گئیں۔ پہلے اُس نے سر جھکایا۔ اور پھر دو زانو ہوگیا۔ اور اپنے ہاتھ والا کنول کا پھول اُن کے چرنوں پر رکھ دیا۔ کسی خاص کشش کے زیر اثر مہر ھشٹر کی آنکھوں سے محبت کے دو گرم آنسو نکلے۔ اور ٹپ ٹپ زمین پر آ رہے!

مہاراج مسکرائے اور نہایت شیریں لہجہ میں بانسری کی سی سریلی آواز میں بولے۔

"میرے پیارے! کس خواہش کو لے کر آئے ہو؟"

"اگر آپ کی نظرِ عنایت ہے تو سب کچھ ہے۔ صرف پربھو کے چرن کملوں کو چھونے کی خواہش اس دل میں باقی ہے۔ اجازت دیجئے"

شری ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے

دو بہترین شاہکار

آگ قیمت سےر | بھونچال قیمت عہ

ملنے کا پتہ

کنول بک ڈپو چوک گھنٹہ گھر امرتسر

ڈاکٹر

کہاجاتا ہے کہ اکثر بنگالی لڑکیاں اپنے شوہر خود ہی منتخب کرتی ہیں مجھے بھی ایسا ہی کرنا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے مجھے بچپن سے ہی شوپوجا اور برت کی لگن تھی؛

میں پورے آٹھ برس کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ کہ میری شادی کردی گئی۔ لیکن شومئے قسمت سے سابقہ گناہوں کے عوض میں اچھا شوہر پاکر بھی اصل معنوں میں اُسے نہ پا سکی۔ چیچک نے میری دونوں آنکھیں چھین لیں۔ اور زندگی کے آخری لمحے تک انہوں نے مجھے خاوند کو دیکھنے کا موقعہ نہ دیا؛

بالکل بچپن میں ہی میری شادی کردی گئی۔ ابھی میں چودھویں برس میں تھی کہ میں نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا۔ میری صحت بہت گر چکی تھی۔ یہاں تک کہ قریب المرگ، لیکن جس کی قسمت میں تکلیفیں اور مصیبتیں کون اٹھائے۔ جو چراغ جلنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ وہ رات بھر جلنے کے بعد ہی وہ بجھتا ہے؛

میں زندہ تو رہی مگر چاہے کمزوری سے کہیں، یا دلی تفکرات سے مجھیں

یا کسی دوسری وجہ سے میری آنکھوں میں درد شروع ہو گیا۔

اس وقت میرے شوہر میڈیکل کالج میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ علاج کا موقع غنیمت جان کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے اپنی معلومات کی بنا پر آپ ہی میرا علاج شروع کر دیا۔

بھیا بھی اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ اور ایل۔ایل۔بی کا امتحان دینے والے تھے۔ ایک دن انہوں نے آ کر میرے پتی سے کہا۔

"بھلا یہ تم کیا کر رہے ہو۔ تم تو نلنی کی دونوں آنکھیں گنوا دینا چاہتے ہو۔ کسی ڈاکٹر کو بلا کر کیوں نہیں دکھلاتے؟"

میرے پتی نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بھلا اچھا ڈاکٹر آ کر اور کون سا علاج شروع کر دیگا؟ جو دوائیاں وغیرہ ہیں۔ وہ تو سب مجھے معلوم ہیں"

"تو تم میں اور تمہارے کالج کے بڑے بڑے پروفیسروں میں کوئی فرق نہ ہوگا" بھیا بگڑ کر بولے۔

میرے پتی نے فیصلہ کن جواب دیا۔ "تم قانون پڑھتے ہو۔ ڈاکٹری کا حال کیا جانو۔ جب تم اپنی شادی کرو گے۔ اور تمہاری بیوی کی جائداد کا کوئی جھگڑا پڑ گیا۔ اور مقدمہ بازی تک نوبت آ پہنچی۔ تو کیا تم میری دلیل کے مطابق کام کرو گے؟"

میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ کہ جب حکومتیں آپس میں لڑتی ہیں۔ تو زیادہ نقصان بے چاری اس گھاس کو ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ جو گھوڑوں کے کھاتے اور روندتے ہیں۔ شوہر اور بھائی دونوں میں جھگڑا ہوا۔ اور دونو طرف سے طعنے ملنے لگے۔ میں نے بھی سوچا۔ کہ جب بھیا مجھے دان کر چکے ہیں۔ پھر میرے متعلق کوئی بات کرنے کی کیا ضرورت۔ اتنا جھگڑا اور شورش کیوں۔ میری تکلیف، مسرت، صحت اور بیماری سب کچھ میرے پتی کے لئے

ہی تو ہے؛

اس دن میری آنکھوں کے متعلق معمولی بحث پر ہی میرے بھیا اور پتی میں کچھ ان بن ہو گئی۔ ایک تو پہلے ہی تکلیف سے میری آنکھوں سے پانی گرتا تھا مگر اس دن سے اور بھی زیادہ جانے لگا۔ مگر اس کی اصلی وجہ نہ تو اسوقت میرے شوہر کے خیال میں آئی۔ اور نہ میرے بھیا کو معلوم ہوئی؛

جب میرے پتی کالج چلے گئے۔ تو اچانک تیسرے پہر کے قریب اپنے ساتھ ایک ڈاکٹر کو لئے ہوئے آئے۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کر کے کہا۔

"اگر ابھی سے ان کی آنکھوں کا پوری طرح علاج معالجہ نہ کیا گیا تو یہ تکلیف آگے چل کر نازک صورت اختیار کر لے گی۔ اور ایشور نہ کرے اسکے ہمیشہ کے لئے اندھا ہو جانے کا خطرہ ہے"!

اتنا کہکر ڈاکٹر نے ایک کاغذ پر دوائی لکھ دی۔ اور بھیا نے ایک آدمی کو دوائی لانے کے لئے بھیجا،

جب ڈاکٹر چلا گیا۔ تب میں نے بھیا سے کہا۔ "بھیا! میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ اس وقت میرا جو علاج ہو رہا ہے۔ آپ اس میں کسی طرح کی رخنہ اندازی نہ کریں"!

میں بچپن سے ہی بھیا سے بہت ڈرتی تھی۔ میں نے جو اپنے منہ سے ان الفاظ کو کہہ دیا۔ یہ میرے لئے ایک حیران کن بات تھی۔ مگر میرے دل کو یقین تھا کہ میرے پتی سے پوشیدہ بھیا جو میرا علاج کر رہے ہیں اس میں مجھے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ نقصان ہی ہے؛

قرائن سے میں نے سمجھا۔ کہ میرے ان فقرات سے بھیا کو بھی کچھ حیرانی ہوئی کچھ دیر چپ چاپ سوچنے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا۔

"اب میں ڈاکٹر کو دوبارہ نہیں بلاؤنگا۔ مگر اب جو دوائی آئے گی اس کو اچھی طرح استعمال کر کے دیکھنا۔ جب دوا آ گئی۔ تو بھیا مجھے اس کے

استعمال کے طریقے سمجھا کر خود چلے گئے۔ اپنے پتی کے کالج سے آنے سے پیشتر میں وہ شیشی، نسخہ، دوائی وغیرہ سب اٹھا کر اپنے آنگن کے پچھواڑے میں پھینک دیا!

بھیا کے ساتھ جھگڑا ہو جانے پر میرے پتی نے اور بھی دوگنی کوشش سے میری آنکھوں کا علاج شروع کر دیا۔ صبح و شام دونو وقت دوا بہتی جانے لگی بیں نے آنکھوں پر پٹی باندھی، چشمہ لگایا۔ بوند بوند کر کے دوا ڈالی۔ پلٹس باندھی، اور جب پھٹکری کے بدبودار تیل پینے پر اندر کی میل صاف کرنے کا طریقہ سوچا گیا۔ تب تک میں بھی اپنے آپ کو دبائے بیٹھی رہی۔ جب کبھی پتی دیو پوچھتے ـــ

"اب کیا حال ہے؟"

میں آہستہ سے کہہ دیتی ـــ "اب میں اچھی ہو رہی ہوں!"

میں اپنے دل میں بھی یہی خواہش رکھتی تھی۔ کہ جیسے میں سچ مچ اچھی ہو رہی ہوں۔ جب پانی زیادہ نکلتا۔ تو میں سمجھتی۔ کہ پانی بہہ جانا اچھا شگون ہے۔ جب نکلنا بند ہو جاتا۔ تب میں سمجھتی۔ کہ اب میں صحت کی منزل پر آگئی ہوں!

مگر کچھ دن بعد علاج بہت مشکل ہو گیا۔ اب سب چیزیں بہت ہی دھندلی دکھائی دینے لگیں۔ اور بوجہ سر درد تو مجھے ہر وقت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں نے دیکھا کہ میرے پتی اب کچھ نا اُمید سے ہو گئے ہیں اور وہ بہت کچھ سوچنے پر بھی یہ نہیں سمجھ سکے۔ کہ اتنے دن بعد اب بھی کسی بہانے سے ڈاکٹر کو بلاؤں!

آخر میں نے ان سے کہا ـــ "اگر بھیا کا دل رکھنے کے لئے تم ایک بار کسی ڈاکٹر کو بلا کر دکھلا دو۔ تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ وہ اس بات کے لئے بڑی ناراضگی سے بیٹھے رہیں مجھے سے کچھ نہیں ... اندر تذبذب ہوتا ـــ

علاج تو آپ ہی کرینگے۔ مگر کسی ڈاکٹر کی صلاح لے لینی بُری نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" پتی بولے۔

اتنا کہہ کر وہ اسی دن ایک انگریز ڈاکٹر کو وہاں لے آئے۔ اُن لوگوں میں جو بات چیت ہوئی۔ اس کا تو مجھے ذرا علم نہیں۔ مگر ہاں میں یہ ضرور کہتی ہوں کہ اس ڈاکٹر نے میرے شوہر کو بہت بُرا کہا۔ اور پتی دیو سر جھکائے چپ چاپ ایک مجرم کی طرح سنتے رہے۔

جب ڈاکٹر چلا گیا۔ تو میں نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہا —"آپ یہ گنوار گورا کہاں سے پکڑ لائے تھے۔ کسی دیسی وید کو لاتے۔ بھلا یہ کیا میری آنکھوں کی بیماری تم سے زیادہ سمجھ سکے گا؟"

پتی دیو بات کاٹ کر بولے —"تمہاری آنکھوں میں نشتر لگانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔"

"یہ تو آپ پہلے ہی جانتے تھے۔ کہ نشتر لگانا پڑے گا۔ مگر شروع میں یہ بات مجھ سے چھپا رکھی تھی۔ کیا آپ یہ سمجھتے تھے۔ کہ میں نشتر سے ڈرتی ہوں؟"

شرم کو دور کرتے ہوئے پتی دیو بولے —"بھلا تم ہی کہو۔ خود آدمیوں کے اندر کتنے ہی ایسے بہادر ہوں گے۔ جو نشتر کا نام سنکر کانپ اٹھتے ہیں۔"

"آدمیوں کی قوت صرف عورتوں کے سامنے ہوتی ہے۔"

"ہاں یہ تو سچ کہا ہے۔ آدمیوں کی بنیاد صرف غرور ہی ہے۔" پتی نے ایک شکست خوردہ آدمی کی طرح جواب دیا۔

میں نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا —"غرور! اس میں کیا تم عورتوں کا مقابلہ کر سکتے ہو؟ اس میں بھی ہماری جیت ہے۔"

اسی دوران میں جیجا آ پہنچے۔ میں نے انھیں الگ لے جا کر کہا

"جیجا! آپ جو ڈاکٹر لائے تھے۔ ... کی ہدایتوں پر میں آج تک عمل کرتی

رہی تھی۔ اس سے میری آنکھیں بہت اچھی ہو گئی تھیں۔ مگر شومئے قسمت سے ایک دن غلطی ہو گئی۔ میں نے کھانے کی دوا آنکھوں میں ڈال لی جس سے اب میری آنکھیں اتنی خراب ہو گئی ہیں، کہ ان کا درست ہونا مشکل ہے لوگ کہتے ہیں کہ آنکھوں میں نشتر لگانا پڑے گا!

"میں سمجھتا تھا کہ ابھی تک تمہارے شوہر کا علاج ہو رہا ہے۔ اس لئے میں تمہارے پاس بھی نہ آسکا!" ـــــ بھیا نے کہا۔

"نہیں میں چوری چوری اس ڈاکٹر کی بتلائی ہوئی دوائی استعمال کرتی رہی ہوں۔ میں نے انہیں اسلئے بتلایا ہی نہیں۔ کہ وہ ناراض نہ ہوں"۔

عورت کے لباس میں آکر جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے۔ مجھے یہ احساس ہوا میں اپنے بھیا کو بھی ناراض نہ کر سکتی تھی۔ اور پتی دیو کی عزت میں بھی فرق نہ لا سکتی تھی!

عورتوں کے لئے اتنے بڑے مکر و فریب کی ضرورت ہوتی ہے!

اس فریب کا انجام یہ ہوا۔ کہ میں نے اندھی ہونے سے پیشتر اپنے خاوند اور بھیا کا اتحاد دیکھ لیا۔ بھیا نے سمجھا کہ چوری سے علاج کرنے کا یہ انجام ہوا۔ شوہر نے خیال کیا کہ اگر شروع سے بھیا کی صلاح پہ چلتے۔ تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ یہ سوچتے ہوئے دونو مجرم دل کے اندر ہی اندر ایک دوسرے سے معافی مانگتے ہوئے بہت قریب قریب ہونے لگے۔ میرے پتی اب بھیا سے صلاح لینے لگ گئے۔ اور بھیا بھی اکثر میرے سوامی جی کی تائید کر دیتے تھے!

آخر ش دونو کی ہی صلاح سے ایک دن ایک انگریز ڈاکٹر نے آکر میری آنکھ میں نشتر لگایا۔ کمزور آنکھ یہ ضرب نہ سہار سکی۔ اور اسکی باقی ماندہ روشنی بھی گم ہو گئی۔ اس کے تعلق سے دوسری آنکھ بھی آہستہ آہستہ کچھ دنوں [illegible] "مبارک نظر" (بنگال میں) ایک شادی کی تھی

کے دن جو چندن سے ملبوس ایک خوب صورت شکل جو میری آنکھوں کے سامنے پہلے پہل روشن ہوئی۔ اس پر ہمیشہ کے لئے پردہ چھا گیا۔ گویا کہ دن کے چمکتے ہوئے میرے خورشید کو ہمیشہ کے لئے چھپا لیا۔ اور میری پاکیزہ دنیا تاریک کر دی۔ میرے پتی اور بھیا بہت پچھتائے۔ مگر بے سود!

ایک دن میرے پتی نے بستر کے پاس آ کر کہا ــــ "میں تمہارے سامنے اپنی فضول شیخی بگھارنا نہیں چاہتا۔ دراصل تمہاری آنکھوں کا دشمن میں ہی بنا ہوں۔ جس نے تمہیں ہمیشہ کے لئے اندھا کر دیا"!

میں نے ان کے تھرتھراتے ہوئے گلے کو سنا۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کے داہنے ہاتھ کو پکڑ کر دباتے ہوئے بولی ــــ "چلو! یہ بھی تم نے اچھا کیا۔ تمہاری چیز تھی۔ تم نے لے لی۔ بھلا تمہیں سوچو۔ اگر میری آنکھیں کسی دوسرے ڈاکٹر سے چلی جاتیں۔ تو اس میں میرا کونسا حصہ آرام پاتا۔ جو کچھ ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ میری آنکھیں تو کوئی درست نہیں کر سکتا تھا۔ آنکھیں تمہارے ہاتھوں سے گئیں۔ بس میرے اندھے ہونے پر بھی ایک مسرت ہے۔ جب پوجا میں پھول کم ہو گئے تھے۔ تو شری رام چندر جی اپنی دونوں آنکھیں نکال کر پوجا پر چڑھانے چلے تھے۔ میں نے بھی اپنے دیوتا کو اپنی بصارت دے دی ہے۔ تم جب اپنی آنکھوں سے کوئی قابل دید چیز دیکھو گے۔ تو مجھے بھی کہہ دیا کرنا۔ میں بھی تمہاری آنکھوں کا دیکھا ہوا پرشاد سمجھ کر اسے منظور کر لوں گی"!

میں یک دم اتنی باتیں نہ کہہ سکتی تھی۔ اور نہ اس طرح سنی جا سکتی تھیں۔ میں یہ باتیں بہت دنوں تک سوچتی رہی۔ دوران جذبات میں جب کبھی طوفان آتا ہے۔ تو میں اپنے آپ کو ایک ناکارہ، مصیبت زدہ اور بد قسمت خیال کرتی مگر اب یہ باتیں میرے دل بہلانے کے لئے رہ گئیں تھیں۔ اس سکون اور ایسی

بھگتی کو اپنا کر میں اپنے آپ کو اپنی تکلیف سے بہت کچھ اونچا کرنے کی خواہش کرتی تھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس دن میں اپنے دل کے کچھ خیالات و جذبات زبانی کہہ کر اور کچھ دل میں چھپا کر ہی انہیں اچھی طرح سمجھا سکی۔

"نلنی میں نے غلطی سے تمہارا جو کچھ گنوا دیا ہے۔ وہ تو اب کسی طرح بھی واپس نہیں آسکتا۔ مگر جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں تمہاری آنکھوں کی تاریکی دور کرنے کے لئے ہمیشہ تمہارے ساتھ رہا کروں گا" پتی دیو نے چپکے سے کہہ دیا۔

"نہیں یہ کوئی بات نہیں ہے۔ تم اپنے گرہست کو اندھوں کا ہسپتال بنا دینا چاہتے ہو مگر میں ایسا کبھی نہ کرنے دوں گی۔ تمہیں دوسری شادی ضرور کرنی ہوگی۔"

شادی کس لئے نہایت ضروری ہے؟ اسے مفصل بیان کرنے سے بیشتر میرا گلہ رک گیا۔ کچھ کھانس کر اور کچھ اپنے آپ کو سنبھال کر میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اتنے میں میرے شوہر نے بات کاٹ کر کہا۔

"میں بے وقوف ہوں۔ خود پرست ہوں۔ سب کچھ ہوں۔ مگر جعل ساز نہیں ہوں میں نے اپنے ہاتھوں سے ہی تمہاری آنکھیں کھو دی ہیں۔ اگر میں آخر اس نقص کی وجہ سے تم سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ اور ایک دوسری بیوی بنا لوں۔ تو میں اپنے اشٹ دیو بھگوان پرشوتم، کرشن کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں برہم ہتیا کا مجرم ہوں گا۔"

میں انہیں اتنی بڑی قسم نہ کھانے دیتی۔ درمیان میں ہی روک لیتی مگر اس وقت آنسو میرے کلیجے کو بہا کر گلے کو دبا کر اور میری آنکھوں کو پوری طرح بھر کر باہر نکلنے کی پوری کوشش کر رہے تھے اور انہیں اندر ہی اندر روک رکھنے کی وجہ سے میں کچھ نہ بول سکتی تھی۔

انہوں نے جو کچھ کہا تھا۔ اسے سن کر میں لامحدود مسرت کی خوش آمدید

میں اپنے منہ کو تکیہ میں چھپا کر رونے لگی۔ میں نے سوچا کہ میں اندھی ہو گئی ہوں۔ پھر بھی وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ درد مند جس طرح درد کو لپٹے دل میں رکھینگے ...... میں اتنی خوش قسمتی نہ چاہتی تھی۔ مگر دل خود غرض ہوتا ہے! جب کچھ زور سے برسنے کے بعد آنسوؤں کا زور کم ہو گیا۔ تب میں نے اُن کا منہ اپنی چھاتی کی طرف کھینچتے ہوئے کہا؛

"بھلا تم نے اتنی بڑی قسم کیوں کھائی۔ میں نے کیا تمہاری خوشی کے لئے تمہیں شادی کرنے کو کہا تھا؟ میں تو سوکن سے اپنی غرض پوری کرتی اور آنکھوں کے بند ہو جانے سے جو کام میں خود نہ کر سکتی وہ اس سے کرایا کرتی!"

"کام تو داسی بھی کر سکتی ہے۔ پھر میں کس غرض کیلئے ایک داسی سے شادی کروں۔ اور پھر میں کس طرح اُسے لا کر اپنی اس دیوی کے ساتھ ایک ہی نشست پر بٹھا سکوں گا؟"

اتنا کہکر میرے پتی نے میرا منہ اپنے دونو ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور میرے ماتھے پر ایک محبت کی مہر ثبت کر دی۔ اُس بوسے سے جیسے میری تیسری آنکھ کھل گئی۔ جیسے میں سچ مچ ہی دیوی کے رتبہ پر پہنچ گئی ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ جب میں اندھی ہو گئی ہوں۔ تب اس بیرونی دنیا میں ایک بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اب میں اس دنیا سے اوپر آٹھ کر دیوی بن کر اپنے خاوند کی شہرت کروں گی۔ اب مکر و فریب کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ایک گرہستی عورت میں جس قدر مکر و فریب اور کمینہ پن ہوتا ہے۔ وہ سب میں نے دور کر دیا!"

اس دن بھر اپنے دل کے ساتھ ایک خاص قسم کی بحث ہوتی رہی۔ اتنی بڑی قسم کھا کر میرے پتی اب کسی طرح بھی دوسری شادی نہیں کریں گے

یہ خوشی جب میرے دل کو ڈسنے لگتی۔ اور میں کسی طرح بھی اس سے چھپا نہیں چھڑا سکتی تھی۔ تب اسوقت میرے دل میں جس نئی دیوی کی جگہ ہوتی تھی۔ وہ کہتی ہے " کیا کبھی کوئی ایسا دن بھی آ سکتا ہے۔ جب اس قسم کو پورا کرنے کی نسبت شادی کرنے میں تمہارے پتی کی عزت ہو" مگر میرے اندر جو پرانی عورت تھی وہ کہتی ہے " بے شک ہو۔ جب انہوں نے اتنی بڑی قسم کھائی ہے۔ تب وہ دوسری شادی کر ہی نہ سکیں گے "

" نہ کریں۔ مگر اس میں تمہاری خوشی کی کونسی بات ہے ؟"

" میں سب سمجھتی ہوں۔ مگر جب انہوں نے قسم کھائی تو وغیرہ وغیرہ۔۔۔"

بار بار یہی ایک بات، دیوی اس وقت بالکل خوش ہو کر دیکھنے لگی اور ایک ہیبتناک شک وشبہ میں میرا دل و دماغ کانپ اٹھا۔ میرے دکھی پتی دیو نے نوکرانی کو منع کر دیا۔ کہ میرے تمام کام خود ہی سرانجام دیں گے پہلے پہل تو مجھے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی ان کا لگا رہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ کیونکہ اس بہانے سے وہ ہمیشہ میرے قریب رہا کرتے تھے۔ میں انہیں آنکھوں سے نہ دیکھ سکتی تھی۔ اسلئے ہمیشہ ان کو پاس رکھنے کی خواہش میرے دل میں بہت بڑھ گئی تھی۔ خاوند کے منہ کا جو حصہ میری آنکھوں کے حصے پڑتا تھا۔ اب دوسرے اعضا بھی اس حصہ کو آپس میں بانٹ کر اپنا اپنا حصہ بڑھانے کی کوشش کرنے لگے۔ اب کسی کام سے پتی دیو زیادہ دیر کرتے تو معلوم ہوتا کہ میں عالم سکتہ میں ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا۔ جیسے میں کچھ کھو بیٹھی ہوں۔ پہلے جب کبھی پتی کالج جاتے اور انہیں آنے میں دیر ہو جاتی۔ تو میں سڑک والے جنگلے کی آڑ سے اُن کی راہ دیکھا کرتی جس دنیا میں وہ گھوما کرتے" اُسے میں اپنی آنکھوں کے سہارے پہلے باندھ لیتی تھی۔ مگر آج میرا بعید البصارت جسم انہیں تلاش کرنے کی خواہش کرتا تھا۔ ان کی زمین کے ساتھ میری زمین کو باندھنے والی جو زنجیر تھی وہ آج ٹوٹ

چکی تھی۔ آج ان کے اور میرے درمیان ایک دشوار گذار تاریکی ہے۔ اب مجھے مجبوراً چپ چاپ بیٹھے رہنا پڑتا۔ میں بیٹھی بیٹھی یہی سوچا کرتی۔ کہ وہ کب اپنے اس کنارے سے میرے اس کنارے آئیں گے۔ اس لئے اب جب وہ ایک لمحہ کے لئے کبھی مجھ سے علیحدہ ہوتے۔ تو میرا سارا اندھا جسم انہیں پکڑنے کے لئے دوڑتا اور بے خود ہو کر انہیں پکارتا۔

اتنی زیادتی اتنا نزدیک رہنا تو بالکل اچھا نہیں۔ ایک تو پتی دیو پر پتنی کا بوجھ ہی کافی ہے۔ اس پر یہ اندھے پن کا بھاری بوجھ نا برداشت ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ گہری تاریکی میں اپنے اوپر ہی سہوں گی؛

میں نے سکون قلب سے یہ عہد کر لیا۔ کہ اپنی اس تاریکی کی وجہ سے میں اپنے خاوند کو اپنے پاس ہی نہیں باندھ رکھوں گی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد میں محض آواز، بو اور چھونے سے ہی اپنی تمام ذمہ واری خود پوری کرنے لگی۔ اب مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ جہاں نظر میرے بہت کم آتی تھی وہاں اکثر مجھے گمراہ بھی کر دیتی تھی۔ مجھے اب پتہ چلا۔ کہ جتنا دیکھنے کا کام ہو سکتا ہے۔ آنکھیں اس سے بہت زیادہ دیکھتی ہیں۔ اور جب آنکھیں پہرہ داری کا کام شروع کر لیتی ہیں۔ تو کان بالکل ساکن ہو کر لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔ جتنا کچھ سننا چاہیے۔ وہ اس کی نسبت کم سنتے ہیں۔ اب نگاہ کی غیر حاضری میں اب میرے دیگر اعضا اپنے اپنے فرائض کی ادائگی پوری طرح کرنے لگے؛

اب میں اپنے پتی کو اپنا کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ اور اُن کے سب کام بھی پہلے کی طرح میں خود ہی کرنے لگی۔ ایک دن پتی نے مجھ سے کہا۔

"تم نے مجھے تلافی گناہ سے بھی جواب دلوا دیا۔

"میں تو یہ جانتی ہی نہیں۔ کہ تمہاری تلافی کس لئے۔ مگر خود اپنے گناہ کا بوجھ میں آپ ہی کیوں بڑھاؤں؟"

مگر جب میں نے انہیں نجات دے دی۔ تب وہ بھی ایک گہری سانس لے کر ایک بڑی بھاری جھنجھٹ میں سے چھٹی پا گئے۔ زندگی بھر اپنی اندھی بیوی کی خدمت کو فرض جاننا آدمی کا کام نہیں،

میرے پتی دیو ڈاکٹری پاس کر کے مجھے اپنے ساتھ لے کر الت پور چلے گئے؛

اس گاؤں میں پہنچ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں اپنی ماں کی گود میں آ گئی ہوں۔ میں اپنی آٹھ سال کی عمر میں گاؤں چھوڑ کر شہر چلی گئی تھی۔ ادھر دس سالوں میں میرے دل میں گاؤں کے لئے ایک دھندلی سی روشنی رہ گئی تھی جب تک آنکھیں تھیں۔ تب تک کلکتہ شہر تمام اطراف سے میری خوشی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جب میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ تب میں نے سمجھا۔ کہ کلکتہ میری آنکھوں کو بہلا دینے والا ہی شہر ہے۔ اب اس شہر سے مجھ کو قرار نہیں آتا۔ آنکھوں کے بند ہوتے ہی میرا وہی بچپن والا گاؤں رات کے ستاروں کی ضیا کی طرح میرے دل میں چمکنے لگا؛

اساڑھ مہینہ کے آخیر میں ہم لوگ ترتی پوری پہنچے۔ نئی جگہ تھی، اس لئے میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ وہ دیکھنے میں چاروں طرف سے کیسا ہے۔ لیکن پھر بھی بچپن میں بو وغیرہ کی مشق نے وہاں کے تمام مناظروں سے میرے تمام اعضاؤں کو گھیر لیا۔ سردی سے بھیگے ہوئے نئے نویلے غنچوں کی وہ اعلیٰ الصبح کے وقت کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا وہی سونے ڈھلے ہوئے سرسوں کے کھیتوں کی تمام آسمان پر پھیلی ہوئی بھینی بھینی خوشبو، وہی گوالوں کا گانا یہاں تک کہ ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر چلنے والی بیل گاڑیوں کی آواز میرے لئے دلکشی کا باعث بن رہی تھی۔ آغاز زندگی کی وہی میری گذشتہ یادداشت اپنی نرالی آواز اور بو سے ..... زمانہ حال میں مجھے چاروں طرف سے گھیر کر بیٹھ گئی۔ اندھی آنکھیں اس کی کسی طرح تردید نہ کر سکیں۔ میں پھر جیسے

لوٹ کر اپنی اس بچپن کی حالت میں آگئی ہوں۔ ہاں صرف اپنی ماں کو میں نہیں پا سکی۔ میں نے دل ہی دل میں دیکھا۔ کہ میری بڑی بہن بال کھولے ہوئے دھوپ کی طرف پیٹھ کیے آنگن میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے۔ مگر اس کے تھرائے ہوئے نازک گلے سے ہمارے گاؤں کے سادھو بھجن داس مرحوم کا گانا مجھے نہیں سن پڑا؛

اپریل آیا۔ چاروں طرف چہل پہل تھی۔ کھیت کاٹے جا رہے تھے۔ مگر دھان کوٹنے کی جو دل کش آواز آیا کرتی تھی۔ وہ کہاں چلی گئی؟

شام کے وقت کہیں نزدیک سے ہی کوئیں کی جانب کچھ روں روں کی آواز سنا کرتی تھی۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے ماں ہاتھ میں چراغ لے کر گور سے کو دکھانے جا رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بھیگی ہوئی سن اور گھاس کے ڈھیلیں کی بو میرے دل میں داخل ہو رہی ہے؛ مجھے ایسا سنائی پڑتا تھا تھا۔ کہ ندی کے اس پار مہا تما رامانند سوامی کے مندر سے گھنٹے اور گھڑیال کی آواز آ رہی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا۔ کہ جیسے کسی نے بچپن کے میرے آٹھ سالوں میں اسکا تمام عرق چھان کر میرے اردگرد رس اور بو کا ڈھیر لگا دیا ہو؛

ساتھ ہی مجھے یہ بھی یاد آیا۔ کہ میں بچپن میں برت رکھا کرتی تھی۔ اور صبح کے وقت پھول توڑ کر شوجی کی پوجا کرتی تھی۔ یہ بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ کلکتے کی بات چیت اور تہذیب و تمدن کے جھگڑے میں عقل میں کچھ نہ کچھ فتور آگیا تھا۔ دھرم کرم، بھگتی اور شردھا وغیرہ میں وہ صاف طبیعت نہیں رہ جاتی اس دن کی بات مجھے یاد آتی ہے۔ جس دن میرے اندھے ہونے کے بعد کلکتے میں میرے پڑوس کی ایک سہیلی نے آکر مجھ سے کہا تھا "دیکھو نلنی! تم ناراض نہ ہونا۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتی۔ تو اپنے خاوند کا کبھی منہ بھی نہ دیکھتی؛

میں نے اسکے سوال کا بڑے تحمل اور سنجیدہ صورت بنا کر جواب دیا تھا۔
"اب منہ دیکھنا تو بند ہو ہی گیا ہے۔ اس کے لئے کم بخت آنکھوں پہ تو ضرور غصہ آتا ہے۔ مگر اپنے پتی کے اوپر کیوں غصہ کروں؟ میرے پتی نے ٹھیک وقت پر ڈاکٹر کو نہیں بلایا تھا۔ اس واسطے میری پڑوسن کو بڑا غصہ تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ میں بھی ان سے ناراض ہو جاؤں۔ مگر میں نے انہیں سمجھایا۔ جان بوجھ کر بھول سے۔ شک سے روزانہ کی طرح۔ کر سکے دُکھ ہوا ہی کرتے ہیں۔ اگر ہم دل میں ہر وقت اس طرح رکھیں۔ تو دُکھ میں بھی ایک قسم کا سکون ملتا ہے۔ نہیں تو فضول جھک جھک یا لڑائی جھگڑے ہوں تو مرکھپتی ہی ہے۔ میں اندھی ہو گئی ہوں۔ یہ تو بہت بڑا دُکھ ہے ہی۔ اب اس کے لئے میں اپنے شوہر سے غصہ کر کے اس دُکھ کے بوجھ کو اور زیادہ وزنی کیوں کروں؟ میرے جیسی لڑکی کے منہ سے اس طرح کی باتیں سن کر پڑوسن نے ناراض ہو کر سر ہلا دیا۔ جھنجھلا کر اپنے گھر چلی گئی۔ چاہے جو کچھ کہا جائے مگر اس میں شک نہیں ہے۔ کہ بُری باتوں میں زہر ہوتا ہے۔ ایسی باتیں بالکل فضول ہی جاتیں پڑوسن کے منہ سے جو غصہ سے بھرے ہوئے الفاظ نکل رہے تھے۔ انہوں نے میرے اوپر دو ایک چنگاریاں پھینکیں گو میں نے اُن چنگاریوں کو پیروں تلے مسل ڈالا۔ مگر پھر بھی اس سے ایک دو داغ رہ ہی گئے۔ اس لئے میں کہتی تھی۔ کہ کلکتے میں بہت بحث مباحثہ ہوتے تھے۔ بہت طرح کی باتیں گھڑی جاتی ہیں:

گاؤں میں آنے پر پھر میری اس شو پوجا کے ٹھنڈے گیندے کے پھولوں کی خوشبو سے دل کی تمام امنگیں اور وچار اس بچپن کی نئی زندگی میں آ گئیں۔ میرا دل اور میری دنیا دیوتاؤں سے بھر گئی۔ بس سر نیچے کر کے لیٹ گئی۔ "ہے دیو! میری آنکھیں چلی گئیں۔ بہت ہی اچھا ہوا۔ تم تو میرے ہو نہ!"

آہ! بھول گئی "تم میرے ہو" یہ بھی ناقص لفظ ہے۔ مجھے تو محض یہی
کہنے کا حق حاصل ہے۔ کہ میں تمہاری ہوں۔ ایک دن گلا دبا کر دیوتا مجھ
سے یہ بات بھی کہلوائیں گے۔ کچھ بھی نہ رہ جائے۔ مگر مجھے تو رہنا ہی پڑے گا
دوسروں کے اوپر تو میرا بس نہیں۔ صرف اپنے اوپر ہے!

کچھ دن بہت سکھ سے بیت گئے۔ ڈاکٹری میں میرے پتی کی اچھی خاصی
شہرت ہونے لگی۔ گرہ میں کچھ پیسے بھی ہو گئے!

دولت کوئی نعمت نہیں ہے۔ اس سے دل میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ دل
جس وقت حکومت کرتا ہے۔ تو اس وقت خود ہی وہ اپنی خوشی کا سامان
بنا سکتا ہے۔ مگر جب خوشی کی بجائے دولت کو پا لیتا ہے۔ تب دل کے
لئے کوئی کام باقی نہیں رہتا۔ پہلے جس جگہ پہ دل کا سکھ رہا کرتا تھا۔ اب
اسی جگہ یہ دولت سکھ جا بیٹھی ہے۔ اس وقت سکھ کی جگہ محض سامان ہی سامان
بچے!

میں کسی بات یا خاص واقعہ کا ذکر نہیں کر سکی۔ مگر یا تو اس وجہ سے
کہ نابینوں میں احساس کی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ اور یا کسی ایسی وجہ سے
جو میں نہیں جانتی۔ میں بہت اچھی طرح سمجھنے لگ گئی۔ کہ دولت کے ساتھ
ساتھ میرے شوہر میں بھی انقلاب ہو رہا ہے۔ شباب کے آغاز میں میرے
خاوند میں انصاف، سچ، نقصان، ثواب، گناہ کے درمیان ہی جو ایک طرح
کا احساس کا مادہ تھا۔ وہ دن بدن پستی کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح
یاد ہے کہ وہ کبھی کبھی کہا کرتے تھے۔ کہ محض روپیہ بٹورنے کی غرض سے ڈاکٹری
نہیں سیکھ رہا ہوں بلکہ اس لئے پڑھ رہا ہوں۔ کہ اس کے ذریعے سے میں
بہت سے غریبوں کا بھلا بھی کر سکوں۔ ڈاکٹری ذریعہ معاش بھی ہے اور
کار ثواب بھی۔ جو ڈاکٹر افلاس زدہ مریض یا قریب المرگ آدمی کے گھر جا
کر بلا فیس نبض نہیں دیکھتا تھا۔ اس کا ذکر کرتے وقت میرے پتی کے

چہرے پر نفرت کے آثار پائے جاتے تھے۔ اور شرم سے ان کے منہ سے بات نہ نکلا کرتی تھی۔ مگر میں سمجھتی ہوں۔ کہ اب وہ بات نہیں رہ گئی۔ اپنے اکلوتے لڑکے کی جان بچانے کے لئے ایک مفلس خاتون نے آکر اُن کے پیر پکڑ لیے۔ مگر اُنہوں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ آخر میں نے اپنے سر کی قسم دیکر بھیجا۔ پھر بھی اُنہوں نے اس کا کام دل دے کر نہ کیا۔ جب ہم لوگوں کے پاس روپیہ کم تھا۔ تب میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ کہ بے رحمی سے روپیہ کمانے کو میرے سوامی کتنا بُرا خیال کرتے تھے۔ مگر آج ہمارے پاس بہت سے روپے جمع ہو گئے۔ ایک دن ایک امیر کا نوکر دو گھنٹے تک تنہائی میں کچھ گفتگو کرتا رہا۔ میں یہ تو نہیں جانتی۔ کہ کیا باتیں ہوئیں۔ مگر جب اس کے چلے جانے کے بعد وہ میرے پاس آئے۔ تو اُنہوں نے بہت ہی مسرت کے ساتھ جدا جدا کئی پہلوؤں پر باتیں کیں۔ اسوقت میں نے اپنے دل کی قوت کو احساس سے محسوس کیا۔ آج وہ اپنے اوپر کلنک لگا کر آئے ہیں!

آنکھ کھونے سے پیشتر میں نے آخری بار جس پتی کو دیکھا تھا۔ وہ پتی اب کہاں ہے؟ جنہوں نے میری دونو اندھی آنکھوں کے درمیان مُہر نبوت ثبت کر کے مجھے ایک دن دیوی کے عہدے پر معمور کیا تھا۔ میں اُن کا کیا کر سکی؟ نفس اور غصہ وغیرہ میں سے کسی دشمن کی زیادتی ہونے پر کسی دن یک دم جن کا زوال ہوتا ہے۔ وہ دل کے کسی دوسرے جوش سے پھر چمک سکتا ہے۔ مگر یہ تو دن بدن بلکہ پل پل پر۔

خاوند کو میں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ تو کوئی بڑے بات نہیں۔ مگر جسوقت مجھے اس بات کا خیال آتا۔ کہ جس جگہ میں ہوں۔ وہاں سوامی نہیں ہیں۔ تو اندر سے میرا دل پھٹنے لگتا۔ میں اندھی تھی۔ بیرونی دُنیا سے بے خبر۔ مگر اندر دل ہی دل میں اپنی پہلی زندگی کے آغاز زمانہ کے پریم بھگتی اور انتہا وشواس کے لئے بیٹھی تھی۔ اپنی آغاز زندگی میں میں نے اپنے

ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنے دیو مندر میں جو لسی کا ارگ دیا تھا۔ اس کی نمی اب تک سوکھی نہ تھی۔ اور میرے پتی دیو یہ چھپایا ٹھنڈک اور مٹھاس کو چھوڑ کر روپے بٹورنے کی غرض سے اس دنیا کے صحرائے اعظم میں نہ جانے کہاں چھپے جاتے تھے۔ بس جس بات پر وشواس کرتی تھی۔ جسے دہرم خیال کرتی تھی۔ جسے تمام عیش و عشرت سے بڑھ کر خیال کرتی تھی۔ میرے پتی بہت دور سے اس بات پر ہنستے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جبکہ ہم ایک دوسرے سے بالکل جدا نہ تھے۔ اسوقت ہم لوگوں نے زندگی کی شاہراہ پر ایک ساتھ ہی سفر شروع کیا تھا۔ اس کے بعد ہم میں کبھی فرق پڑنا شروع ہوگیا۔ یہ نہ تو وہ جان سکے۔ اور نہ ہی میں سمجھ سکی اب آخرش وہ دن آن پہنچا۔ جب کہ میں پکارتی ہوں۔ تو مجھے کوئی جواب نہیں ملتا۔

کبھی کبھی میں سوچا کرتی۔ کہ اندھی ہونے کی وجہ سے میں کسی معمولی بات کو بہت بڑھا کر دیکھتی ہوں۔ اگر میری آنکھیں رہتیں۔ تو بہت ممکن تھا کہ میں دنیا کو ٹھیک اسی حالت میں سمجھتی اور پہچانتی۔ جس حالت میں وہ دراصل ہے۔

ایک دن میرے پتی نے مجھ سے یہی بات سمجھا کر کہا تھا۔ اس دن صبح صبح ہی ایک بوڑھا شخص اپنی پوتی کے ہیضے کا علاج کرانے کے لئے انہیں بلانے آیا۔ تو میں نے کہتے سنا۔ کہ

"ڈاکٹر صاحب! میں بہت مفلس ہوں۔ خدا آپ کا بھلا کرے گا۔"

"خدا جو کریگا۔ کرے گا ہی۔ مگر محض اس سے تو تمہارا کام نہیں چل سکے گا۔ اس لئے پہلے یہ بتلاؤ کہ تم کیا کروگے؟"

یہ سننے کے بعد میں سوچنے لگی کہ ایشور نے مجھے اندھا تو کر دیا۔ مگر بہرہ کیوں نہ کیا۔ بوڑھے نے بھی سانس لی اور کہا۔

"اُف رے خدایا!"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں نے اسی وقت خادمہ کے ہاتھ اسے گھر کی کھڑکی کی طرف بلایا اور کہا۔

"بابا! تمہاری پوتی کے علاج کے لئے میں تمہیں روپیہ دیتی ہوں۔ تم میرے سوامی کیلئے دعا کرو۔ اور کسی دوسرے ڈاکٹر سے مشورہ لے لو!"

دن بھر کھانا پینا اچھا نہ لگا۔ تیسرے پہر اٹھنے کے بعد سوامی نے کہا۔

"آج تم مجھ کو اداس سی دکھائی دیتی ہو!"

وہ ہی مستقل جواب زبان پر آ رہا تھا۔ میں پہلے کی طرح کہنا چاہتی تھی۔۔۔ "نہیں کچھ بھی نہیں ہوا!"

مگر اب مکر و فریب کے دن چلے گئے تھے۔ میں نے صاف کہہ دیا۔

"میں کئی دنوں سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ مگر جب میں کہنے لگتی ہوں۔ تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں نے کیا کہنا ہے؟ میں نہیں جانتی کہ میں اپنے دل کی بات تم سے ٹھیک طور پر کہہ بھی سکوں گی یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تم اپنے دل میں سمجھ سکتے ہو، کہ ہم دونوں ہستیوں نے جس طرح زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ایک ہو کر بھی آج ہم لوگ ایک نہیں ہیں، الگ ہو گئے ہیں!"

"بس یہ بات! انقلاب تو قدرت کا دوسرا نام ہے۔ تبدیلی تو ایک خدائی قانون ہے!"

"دولت و حشمت، شکل و صورت اور بڑھاپہ شباب سب میں تغیر و تبدل ہوتا ہے۔ مگر کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ جو ہمیشہ ثابت رہے؟"

ذرا سنجیدگی سے انہوں نے کہا۔۔۔ "دیکھو۔ دیگر عورتیں کئی کئی طرح سے دکھ سہتی ہیں۔ کسی کا پتی کچھ کما کے نہیں لاتا۔ کسی کا خاوند اس سے محبت نہیں کرتا۔ مگر تم بیٹھے بٹھائے تکلیف کو آسمان سے کھینچ لائی ہو!"

اسوقت میں نے سمجھ لیا۔ کہ اندھی ہونے سے میری آنکھوں میں ایک نیا سرمہ لگ گیا ہے۔ جو مجھے اس عالم سے کہیں بہت دور لے گیا ہے۔ میں دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہوں۔ میرے پتی مجھے پہچان نہ سکیں گے۔

اس دوران میں میری ایک بوڑھی پھوپھی اپنے بھتیجے کا حال دریافت کرنے کے لئے اپنے گھر سے آئی۔ یوں ہی ہم دونو اسے پرنام کرنے کے لئے آٹھ کر گئے توں ہی پہلی بات اس نے یہی کہی۔

"بہو! بھلا تم تو بد نصیبی سے اپنی دونو آنکھیں کھو بیٹھی ہو مگر میرا راکیش ایک اندھی بیوی لے کر اپنے گرہست کو کس طرح چلائیگا اسکا ایک اور بیاہ کرا دو"

اگر اسی وقت پتی جی صرف مسکرا کر یہی کہہ دیتے کہ — "بُوا! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تم کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر بیاہ کرا دو"

تو ساری بات ہی صاف ہو جاتی۔ مگر اُنہوں نے کچھ ناراض ہو کر کہا۔

"بھلا بُوا! تم یہ کیا کہہ رہی ہو"

"واہ! اس میں بھلا میں بے انصافی کی کونسی بات کر رہی ہوں۔ بہو! تم ہی کہو اس میں میں بُرا کیا کہہ رہی ہوں؟"

میں نے بھی ہنس کر کہہ دیا — "بُوا جی! تم بھی اچھے آدمی سے صلاح لے رہی ہو۔ جسکی جیب کاٹنی ہوتی ہے۔ کیا اُسے پہلے پوچھ لیا کرتے ہیں؟"

"ہاں! یہ بات تو تم نے ٹھیک کہی۔ اب ہم تم اس بارے میں چھپ کر صلاح کرینگے۔ کیوں راکیش! ٹھیک ہے نا؟"

"لیکن بوا! پھر بھی میں تم سے ایک بات کہے دیتی ہوں۔ ویشنوں کی عورت کی جتنی زیادہ سوکن ہوں۔ اتنی اس کی اور اس کے پتی کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہمارا لڑکا اگر ڈاکٹری نہ کر کے صرف شادی ہی کرتا تو اسے روزگار کی بھی فکر نہ کرنی ہوتی۔ مریض ڈاکٹر کے ہاتھ میں آتے ہی مرجاتا ہے۔ اور جب ہی وہ مرجاتا ہے۔ تب ڈاکٹر کو فیس نہیں ملتی۔ مگر ویشنو پر خدا کی ایسی

رحمت نازل ہے. کہ اسکی بیوی کی موت ہی نہیں ہوتی۔ اور وہ جتنی دیر زیادہ زندہ رہے۔ اتنی اسکی عزت وشہرت ہے۔"

دو دن پیشتر میرے سوامی نے میرے سامنے ہی اپنی بُوا سے پُوچھا

"بواجی! کیا تم بھلے گھر کی کوئی لڑکی ڈھونڈ سکتی ہو۔ جو گھر کے آدمی کیطرح تمہاری مددگار بن سکے۔ اب انہیں آنکھوں سے تو دکھائی نہیں دیتا۔ اگر کوئی ایسی لڑکی مل جائے۔ جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہا کرے تو میں بے فکر ہو جاؤں"

جب میں اندھی ہوئی تھی۔ اگر اس وقت شروع شروع میں یہ بات کہی جاتی تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ میرے ذریعہ میرے اندھے پن سے گھر کا کون سا کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ تو بھی میں نے کسی طرح کی تردید نہ کی۔ میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ بُوا نے کہا۔

"لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ میرے جیٹھ کی بھی ایک لڑکی ہے۔ وہ دیکھنے میں اتنی خوبصورت ہے۔ کہ آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ ہے بھی وہ جوان"

"بس ہم لوگ یہی دیکھ رہے ہیں۔ کہ کوئی گھر ور اچھا مل جائے۔ تو اسکی شادی کر دیں۔ اگر تمہارے جیسا برسرروزگار دلیش مل جائے۔ تو ابھی شادی ہو سکتی ہے"

پتی نے بڑی حیرانگی سے جواب دیا۔۔۔ "ہیں! شادی کے لئے کس نے کہا ہے؟"

"اگر تم شادی نہیں کرو گے۔ تو کیا یوں ہی کسی بھلے گھر کی لڑکی تمہارے پاس آکر رہے گی"

بات نہایت ٹھیک تھی۔ میرے شوہر اسکا مناسب جواب نہ دے کر خاموش ہو گئے۔

میں اندھی آنکھوں کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں اکیلی کھڑی ہو کر اوپر کی طرف منہ کر کے پکارنے لگی۔

بھگوان! اے بھگوان!! میرے شوہر کی حفاظت کرو۔ انہیں وعدہ شکنی

کے گناہ سے بچاؤ!"

اس کے کئی دن بعد ایک دن میں پوجا سندھیا کر کے باہر آرہی تھی۔ تو بُوا نے کہا۔

"بہو! اپنے جیٹھ کی جس لڑکی کی بابت تم سے ذکر کیا تھا نا۔ وہ آج گھر سے یہاں آگئی ہے۔ دیکھو موہنی! یہ تمہاری بڑی بہن ہیں۔ انہیں پرنام کرو؟"

اس دوران میں میرے سوامی جھٹ پٹ آگئے۔ مگر ایک ناواقف عورت کو دیکھ کر واپس جانے والے ہی تھے۔ کہ بُوا نے پکارا۔

"راکیش! کہاں جارہے ہو؟"

"یہ کون ہے؟" ــــ سوامی نے اضطراب سے پوچھا۔

"یہ میرے جیٹھ کی لڑکی موہنی ہے"

"یہ کب آئی؟ اسے کون لایا؟ کیوں آئی؟ وغیرہ وغیرہ کئی طرح کے سوال و جواب کرنے کے بعد میرے سوامی نے بار بار حیرت ظاہر کی۔

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو میں سمجھ رہی ہوں لیکن پھر بھی مجھے دھوکہ میں ڈالنے کے لئے یہ مکر و فریب کا جال کیوں بچھایا جارہا ہے۔ چوری چوری باتیں کرنا۔ جھوٹ بولنا۔ وغیرہ وغیرہ اگر اپنی ابتر حالت کے لئے تم گناہ کرنا چاہتے ہو تو کرو۔ مگر میرے ہی تنزل کا سامان کیوں پیدا کرتے ہو؟"

میں موہنی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔ اس کے منہ اور جسم پر ہاتھ پھیر کر میں نے دیکھا۔ کہ وہ خوبصورت ہے اور عمر بھی کوئی سولہ سترہ سال سے کم۔ زیادہ نہیں۔ ایک حسین دوشیزہ ہے۔

لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا ــــ "دیدی! یہ کیا کر رہی ہو؟ کیا میرا بھوت بھگا رہی ہو؟"

اس دلفریب میٹھی ہنسی سے جیسے میرے تاریک بادل لمحہ بھر کے لئے

کافور ہو گئے۔ میں نے اپنا ہاتھ اسکے گلے میں ڈالکر کہا۔

"میں تمہیں دیکھ رہی ہوں"

یہ کہہ کر میں نے دوبارہ اس کے نازک منہ پر ہاتھ پھیرا۔

"دیکھ رہی ہو"، اتنا کہہ کر وہ پھر ایک دفعہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی اور بولی

"کیا میں تمہارے باغ کا پھول ہوں؟ جو ہاتھ اٹھا کر دیکھ رہی ہو"

اسوقت میرے دل میں خیال آیا کہ سوہنی کو میرے اندھے پن کی بابت کوئی علم نہیں۔ میں نے کہا۔ "بہن میں اندھی ہوں"

یہ سن کر اُسے کچھ حیرانی ہوئی۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے بہت اچھی طرح سمجھ لیا۔ کہ وہ اپنی سُرخ نگاہوں سے مجھ اندھی کے جسم کو بغور معائنہ کر رہی ہے۔ تھوڑی دیر

سوہنی۔ "اوہو! اسلئے تم نے بُوا کو یہاں بلایا ہے"

"نہیں! میں نے اُنہیں نہیں بلایا ہے۔ وہ خود ہی یہاں تشریف لائی ہیں"

دوشیزہ پھر ہنس کر بولی۔ "تو کیا وہ دوا بن کر یہاں آئی۔ تب تو وہ رحم دل دیوی یہاں سے ٹلے گی نہیں۔ لیکن بُوا جی نے آخر مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟"

اس وقت بُوا گھر میں داخل ہو گئی۔ تب تک وہ میرے شوہر سے کچھ بات چیت کر رہی تھی۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سوہنی بولی۔ "چاچی! ہم لوگ گھر کب جائیں گے؟"

بُوا۔ "ابھی! واہ!! یہاں آئے ذرا دیر نہیں ہوئی۔ اور اب چلنے کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ ایسی شوخ لڑکی تو میں نے آجتک نہیں دیکھی"

سوہنی۔ "چاچی! مجھے تو تمہارے یہاں سے چلنے کے آثار معلوم نہیں ہوتے مگر تمہارا تو یہ ہوا اپنا گھر۔ تمہارے جتنے دن خوشی ہو یہاں رہ سکتی ہو مگر میں تم سے کہے دیتی ہوں۔ کہ میں کل یہاں سے چلی جاؤں گی"

یہ کہنے کے ساتھ ہی موہنی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔ "کیوں بہن! میں ٹھیک کہتی ہوں نا، آخر تم لوگ کوئی ہمارے اپنے تو ہو نہیں "

یہ فقرے موہنی نے کچھ ایسے انداز سے کہے۔ کہ میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ صرف اُسے اپنی طرف کھینچ کر گلے سے لپٹا لیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ بُوا چاہے لاکھ کوشش کرے۔ مگر اس مجسمہ ناز کو قابو کرنا اس کے لئے مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ بُوا نے اوپر سے ظاہرہ کچھ عزت ظاہر کی۔ بوا نے یہ تمام باتیں اس طرح اُڑا دینی چاہیں جس طرح ایک بچی کے لاڈ کی کچھ پرواہ نہیں کی جاتی۔ اور وہ ہنستے ہوئے وہاں سے جانے لگی۔ مگر پھر نہ جانے کیوں لوٹ آئیں۔ اور موہنی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔۔

"موہنی چلو! تمہارے نہانے کا وقت ہو گیا ہے"

موہنی نے میرے پاس آ کر جواب دیا ــــ "ہم دونو گھاٹ پر نہانے جائینگی۔ کیوں جی۔ ٹھیک ہے نا"

دل ناخواشتہ بُوا وہاں سے خاموش ہو کر چلی گئی۔ اُنہوں نے سوچا کہ اگر میں نے اس وقت بات بڑھائی۔ تو موہنی کی ضرور جیت ہو گی۔ اور ان لوگوں کا آپس میں جھگڑا میرے لئے ناگوار ہوگا۔

گلی سے گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے موہنی نے کہا۔

"کیوں جی! تمہارے کوئی لڑکا لڑکی نہیں ہوا"

"نہیں"

"کیوں"

"میں کیا جانوں۔ کیوں نہیں ہوا۔ ایشور نے نہ چاہا نہیں ہوا"

"تب تو تم نے کوئی گناہ ضرور کیا ہوگا"

"یہ بھی وہ انتریامی ہی جانتے ہیں"

ثبوت دیتے ہوئے لڑکی نے کہا۔ "دیکھونا! چاچی دل سے بہت کالی ہے۔ اس لئے آج تک کوئی اولاد نہیں ہوئی"!

گناہ ثواب، شکھ دکھ، سزا معافی، آغاز انجام وغیرہ کا راز تو میں خود نہیں جانتی تھی۔ تو اسے کیا سمجھاتی۔ میں نے ایک سرد آہ بھری۔ اور دل ہی دل میں کہا۔ تمہیں جانو۔ موہنی نے مجھے زور سے پکڑ کر لپٹا لیا۔ اور ہنستے ہوئے کہا "کیوں جی! میری بات پر بھی تم سرد آہ بھرتی ہو۔ بھلا میری بات پر بھی کوئی غور کیا کرتا ہے؟"

میں نے دیکھا کہ میرے سوامی کی پریکٹس میں بھی اب خلل پیدا ہونے لگا اگر کوئی دور سے بلانے آتا تو وہ جاتے ہی نہیں۔ اگر کوئی آس پاس کے مریض کو دیکھنا ہوتا۔ تو وہ جلدی سے دیکھ کر آجاتے ہیں۔ پہلے جب کبھی وہ فرصت ملنے پر گھر میں رہا کرتے تھے۔ تب صرف دوپہر کے وقت کھانے کے لئے اور رات کو سونے کے لئے گھر میں رہا کرتے تھے۔ مگر دوران کام میں بھی کبھی لبوا انہیں بلا لیتی تھی۔ اور کبھی وہ خود بلا وجہ لبوا کی خبر لینے کئی بار آجایا کرتے تھے۔ لبوا جب کبھی زور سے پکارتی۔

"موہنی! ذرا میرے پان کا ڈبہ تو لانا بیٹی؟"

تو میں سمجھ جاتی۔ کہ میرے پتی لبوا کے کمرے میں ہیں۔ شروع شروع میں دو تین دن لبوا پان کا ڈبہ، تیل کی بوتل، سندھور کی ڈبی وغیرہ جو چیز طلب کرتی۔ موہنی دے آتی تھی۔ مگر دو تین دن بعد ایسا ہونے لگا۔ کہ جب بھی اُسے آواز دی جاتی۔ تو وہ اپنی جگہ سے ہلتی نہ تھی۔ ہاں! جو چیز مانگی جاتی۔ نوکرانی کے ہاتھ بھجوا دیتی۔ ادھر لبوا آواز پر آواز دیتی رہتی اور ادھر دوشیزہ جیسے مجھ سے رحم کی درخواست کرتی ہوئی مجھے زور سے خود سے لپٹا لیتی! اس وقت مجھے ایک شک و شبہ گھیر لیتا۔ اب وہ کبھی بھول کر بھی میرے سوامی کا ذکر نہ کرتی!

اسی دوران میں میرے بھیا مجھ سے ملنے کیلئے آئے۔ میں جانتی تھی۔ کہ بھائی کی نظر بہت تیز اور گہری ہے۔ یہاں آج کل کیا حالات ہو رہے ہیں ان سے یہ چھپانا قطعی ناممکن ہوگا۔ میرے بھیا بڑے دُور اندیش تھے مجھے سب سے زیادہ اندیشہ اسی بات کا تھا کہ میرے بھیا کے سامنے میرے پتی ہی قصوروار ٹھہریں گے۔ میں نے ضرورت سے زیادہ خوش رہ کر ان باتوں پر پردہ ڈالے رکھا۔ میں نے خوب باتیں کر کے اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کر کے اور خوب دھوم دھام سے چاروں طرف ڈھول اڑا دینے کی خواہش کی۔ مگر میری یہ سب باتیں اتنی زیادہ بعید الطبع تھیں کہ صرف اپنی وجوہات سے ہی بلیں اور زیادہ گرفتار ہو گئی۔ مگر بھیا زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ میرے سوامی کی شوخی اتنی زیادہ ہو گئی۔ کہ انہوں نے صاف معنوں میں بے رُخی اختیار کر لی تھی۔ بھیا چلے گئے۔ الوداع کے وقت انہوں نے بہت دیر تک محبت بھرا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھے رکھا۔ میں نہیں سمجھ سکی کہ دل ہی دل میں انہوں نے ایک سوئی سے کیا آشیرباد دی۔ مگر ہاں میرے آنسوؤں سے تر رخساروں پر اُن کے بھی آنسو آ پڑے،

مجھے یاد آتا ہے کہ چیت کی شام تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ دُور سے بارش لئے ہوئے ایک آندھی آ رہی تھی۔ اُسی وجہ سے بھیگی مٹی کی خوشبو اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے آسمان گھر رہا تھا۔ اندھیرے میں لوگ گھبرا گھبرا کر اپنے گھبرائے ہوئے ساتھیوں کو پکار رہے تھے۔ میرے کمرے میں جب تک میں اکیلی رہتی تھی۔ کوئی چراغ نہیں جلتا تھا۔ ڈر رہتا کہ کہیں تیل کی لَو سے میری دھوتی نہ جل جائے۔ میں اس تاریک کمرے میں زمین پہ بیٹھی تھی دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے اس لامحدود مالک دوجہان سے پکار کر کہہ رہی تھی:

"دیکھو! بھگت وتسل بھگوان! جب میں نادان تمہاری بخشش کو سمجھ نہیں سکی۔ جب تمہارا مطلب سمجھنے سے محروم رہ جاتی ہوں۔ تب ...

شکستہ نیم دل کی آگ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کلیجے میں دبا رکھتی ہوں پھر بھی طوفان کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہ جاتی ہوں۔ ناتھ! اب تم کہاں تک امتحان لوگے۔ بھلا مجھ میں اتنی طاقت ہی کہاں ہے؟" اتنا کہتے کہتے میری آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ میں پلنگ پر سر رکھ کر رونے لگی۔

مجھے گھر کا تمام کام کاج کرنا پڑتا تھا۔ موہنی بھی سائے کی طرح برابر میرے ساتھ لگی رہتی۔ کئی بار رونے کو دل چاہتا مگر روئی نہ۔ آج بہت دنوں کے بعد آنکھوں کا پانی باہر نکلا تھا۔ اتنے میں میں نے دیکھا۔ میرا پلنگ کچھ ہلا! اور کسی کے چلنے کی کچھ آہٹ سنائی دی۔ لمحہ بھر میں موہنی میرے جسم سے لپٹ گئی۔ اور چپ چاپ اپنے آنچل سے میری آنکھوں کو پونچھنے لگی۔ میں نہیں سمجھ سکی۔ کہ وہ شام کے وقت ہی کیا سوچ کر میرے پلنگ پر کب سے آکر لیٹی ہوئی ہے۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ میں نے اس سے کوئی ذکر نہ کیا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ماتھے پر اپنا نازک ہاتھ پھیرنے لگی۔ اسی دوران میں کب بادل گرجے کب موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ اس کا مجھے کچھ علم نہیں۔ ایک گہرے سکون نے آکر میرے گرم دل کو ٹھنڈا کر دیا۔

دوسرے دن موہنی نے بوا سے کہا ـــ "چاچی! تم چاہے جاؤ نہ جاؤ۔ مگر میں آج ضرور چلی جاؤں گی"۔

"بھلا اس کی کیا ضرورت ہے بیٹی۔ میں بھی کل ہی چلوں گی۔ میرے ساتھ ہی چلنا نہ دیکھو میرا اکیش تمہارے لئے ایک اصل موتی کی انگوٹھی بنوا کر لایا ہے۔" یہ کہکر اس نے وہ انگوٹھی بڑے ناز سے موہنی کے ہاتھ پر رکھ دی۔

موہنی نے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔ انگوٹھی لے کر بول اٹھی ـــ

"دیکھو چاچی! میں کیسا اچھا نشانہ لگاتی ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے جنگلے میں سے تاک کر انگوٹھی صحن کے درمیان پھینک دی۔

"بُوا..." میرے ہاتھ کو زور سے پکڑ کر کہا۔

"دیکھو بہو! خبردار! اس کی لڑکپن کی باتوں کا ذکر راکیش سے بالکل نہ کرنا
وہ سنے گا تو اُسے دُکھ ہوگا۔"

کہنے کو تو تاؤ نے یہ کہہ دیا۔ مگر یہ نہ سوچا کہ اگر انہیں اس کے لڑکپن پر
دُکھ ہوگا۔ تو کیا مجھے اس کی ادا بُری نہ معلوم ہوگی۔ لیکن دل پر پتھر رکھ کر
میں نے جواب دیا۔

"نہیں تاؤ جی! آپکے کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں اُن سے کچھہ نہ کہونگی۔"
دوسرے دن چلنے سے تھوڑی دیر پیشتر موہنی نے مجھے زور سے لپٹا لیا
پھر کہا۔ "بہن! مجھے بھول نہ جانا۔ یاد رکھوگی نا؟"

"بہن! اندھے کوئی بات نہیں بھولتے۔ میرے لئے دنیا تو ہے ہی نہیں
میں تو محض ایک دل کا ہی آسرا لئے ہوئے ہوں" اتنا کہکر اسکا ماتھا سونگھا
اور چوما۔ میری اندھی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اسکے بالوں پر گرنے لگے
موہنی کے الوداع ہو جانے پر جیسے میری ساری کھیتی سُوکھ گئی۔ وہ میرے
جسم و جان میں جو خوشبو، خوب صورتی، راگ، سنہری روشنی اور جو نازک
دل لائی تھی۔ وہ سب معدوم ہو گئے۔ اس کے چلے جانے پر میں اپنے دونو
ہاتھ پھیلاکر چاروں اطراف اپنی ساری دنیا کو دیکھنے لگی۔ کہ کہاں میرا کون ہے
میرے پتی نے بڑھ کر بڑی مسرت اور اطمینان سے کہا۔

"وہ لوگ چلے گئے۔ جان چھوٹ گئی۔ اب مجھے کام کاج کرنے کے لئے وقت
مل سکے گا۔"

"آہ مجھے لعنت ہے۔ میرے لئے اتنی چالاکی کیوں! بھلا کیا میں سچائی سے
خوف کھاتی ہوں؟ کیا مجھے موہنی سے کوئی ڈر محسوس ہوا ہے؟ کیا میرے
سوامی یہ بات نہیں جانتے کہ جب میں نے اپنی دونو آنکھیں کھوئی تھیں
اس وقت کتنے استقلال بھرے دل سے میں نے ہمیشہ کے لئے تاریکی کو
منظور خاطر بنایا تھا؟"

اتنے دنوں تک میرے اور سوامی کے درمیان محض اندھے پن کا ہی پردہ تھا۔ مگر آج سے ایک اور نئی دیوار حائل ہو گئی۔ میرے سوامی کبھی بھول کر میرے سامنے موہنی کا نام نہیں چلتے۔ جیسے اُن کے خیالات عالم میں موہنی کا کبھی وجود ہی نہیں ہوا۔ مگر میں اس بات کو اچھی طرح سے محسوس کر سکتی تھی کہ وہ خطوں کے ذریعہ اس کی بابت اچھی طرح آگاہ رہتے ہیں۔ جس وقت تالاب میں طغیانی کا پانی ملتا ہے۔ اس وقت کنول کی نازک ڈنڈیوں پر کھچاؤ پڑتا ہے ٹھیک اسی طرح جس دن سوامی کے دل میں ذرا سی تبدیلی ہوتی تھی۔ میں اپنے دل کی جڑوں سے جانچ لیا کرتی تھی۔ مجھ سے یہ بات بھی چھپی نہ رہتی تھی۔ کہ اُسے کب موہنی کا احوال ملتا ہے۔ اور کب نہیں ملتا۔ لیکن میں بھی انہیں اسکی یاد نہیں دلا سکتی تھی۔ میرے تاریک دل میں وہ جوش، مسرت، روشن اور خوبصورت تارا عمر بھر کے لئے چمکا تھا۔ اس کا احوال جاننے کے لئے اور اسکی بابت گفتگو کرنے کو میرا دل ہمیشہ پیاسا رہتا تھا۔ مگر اپنے سوامی کے سامنے لمحہ بھر کے لئے ابھی اس کا نام لینے کا مجھے کوئی حق حاصل نہ تھا۔ ہمارے درمیان رحمدلی ایک ساکن خیال کی طرح بیٹھی ہوئی تھی!

اپریل کی آخری تاریخوں میں کسی دن داسی نے آکر کہا۔

"بہو جی! گھاٹ پر بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ ایک کشتی تیار کی جا رہی ہے۔ بابو جی کہیں جائیں گے؟"

میں جانتی تھی کہ چپکے چپکے کوئی تیاری ہو رہی ہے۔ میری سیاہ تقدیر پر پہلے ہی ایسی خاموشی اور سونا پن کی چھائی ہوئی تھی۔ جو آندھی سے پیشتر ہوا کرتی ہے۔ مگر اب قیامت کے ہیبت ناک بادل اس پر سرعت سے گھر رہے تھے۔ فرشتہ عدل بھگوان شنکر بے حس انگلی کے اشارے سے اپنی تمام قوت قیامت کو میرے سر کی طرف بھیج رہے تھے۔ یہ سب باتیں میں پہلے ہی سے اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ میں نے داسی سے کہا۔

"نہیں! مجھے تو ابھی تک کوئی علم نہیں ہوا"

داسی کا مجھ سے اور کوئی سوال کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر چلی گئی۔ اور مجھے ایک گہری تاریکی میں گم کر گئی!

بہت رات گذرنے پر میرے سوامی نے میرے پاس آکر کہا ۔

"بہت دور سے مجھے ایک بلاوا آیا ہے۔ علی الصبح ہی مجھے یہاں سے جانا ہوگا میرا خیال ہے کہ وہاں سے لوٹنے کے لئے دو چار دن لگ جاوینگے"

میں پلنگ پر سے اٹھتی ہوئی بولی ــــ "مجھ سے جھوٹ موٹ باتیں کیوں بنا رہے ہو؟"

"میں نے اس میں ... کیا ... جھوٹ ... کہا؟"

"تم شادی کرنے جا رہے ہو؟"

وہ چپ ہو گئے۔ میں کھڑی رہی۔ بہت دیر تک گھر میں کوئی آواز پیدا نہ ہوئی۔ آخر میں نے ہی اس مہر سکوت کو توڑتے ہوئے سوامی سے کہا ۔

"مجھے ایک بات کا جواب دو۔ کہو کہ میں شادی کرنے جا رہا ہوں"

گنبد میں جاکر اگر کوئی شخص بلند آواز سے بولے تو اس کے کانوں میں وہی آواز آئے گی۔ میرے پتی نے بھی اسی طرح جواب دیا ۔ مگر ایک دو لفظ زائد

"ہاں! میں شادی کرنے جا رہا ہوں"

"نہیں، تم ہرگز جانے نہ پاؤ گے۔ اس مصیبت میں۔ اس بڑی قسم سے میں آپکو بچاؤں گی۔ اگر میں اتنا بھی نہ کر سکی۔ تو پھر میں تمہاری بیوی کیسے بن سکوں گی۔ میری شو پوجا اور کس کام آئے گی"

گھر میں سناٹا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے زمین پر گر کر سوامی کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا ۔

"میں نے تمہارا کیا قصور کیا ہے۔ مجھ سے کس بات میں بھول ہو گئی ہے۔ تمہیں کس لئے دوسری شادی کرنے کی ضرورت ہوئی ہے۔ تمہیں میرے

سر کی قسم سچ سچ کہو۔"

اس پر میرے سوامی نے کہا۔

"میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔ تمہارے اندھے پن نے تمہیں ایک ایسی تاریکی میں ڈھکیل دیا ہے۔ جس میں میں داخل نہیں ہو سکتا۔ تم میرے لئے ایک دیوی ہو۔ اور دیوی کی طرح ہی میرے لئے ڈراؤنی ہو۔ تمہارے ساتھ رہ کر میں اپنے گھر اور گرہست کو نہیں چلا سکتا۔ مجھے ایک ایسی معمولی عورت چاہیئے، جسے میں جھڑکوں، کوسوں، پیار کروں، محبت کروں، لاڈ کروں گہنے کپڑے پہناؤں۔ وغیرہ وغیرہ سب کام کروں۔"

"ذرا میرا کلیجہ چیر کر دیکھو۔ میں بھی بہت ہی معمولی عورت ہوں میرے دل میں بھی نئی نویلی دلہن کی اُمنگوں کے سوائے اور کچھ نہیں ہے۔ میں یقین کرنا چاہتی ہوں۔ محبت کرنا چاہتی ہوں۔ پوجا کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے دُکھ اور مصیبت دے اور اُونچا نہ کرو۔ سب باتوں پر مجھے اپنے چرنوں پر ہی رکھو۔"

بھلا کیا مجھے یاد ہے۔ اس دن میں نے اور کیا کچھ کہا۔ کیا اتھاہ سمندر اپنی گرج کو آپ ہی سن سکتا ہے۔ محض یہی یاد ہے۔ میں نے کہا تھا۔

"اگر میں ستی ہوں۔ پاکدامن ہوں تو میں بھگوان کو ساکھشی کر کے کہتی ہوں کہ تم کبھی بھی اپنے دھرم سے کہی گئی قسم کو نہ توڑ سکو گے۔ اس قسم کو توڑنے سے پیشتر یا تو میں بیوہ ہو جاؤں گی یا موہنی ہی اس دُنیا میں نہ رہے گی۔"

اتنا کہہ کر میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ مگر جس وقت مجھے ہوش آئی طنبورا ن صبح کی آواز آ رہی تھی۔ میرے پتی دیو چلے گئے تھے۔

میں سندر کے کمرے میں چلی گئی۔ کواڑ اندر سے بند کر کے پوجا کرنے بیٹھ گئی دن بھر میں اس کمرے سے باہر نہ نکلی۔ شام کے وقت بساکھی کی آندھی سے دالان ہلنے لگا۔ میں نے یہ نہیں کہا۔ کہ ہے ٹھاکر دیو! میرے پتی دیو ابھی تک ندی کے قریب ہوں گے۔ ان کی حفاظت کرنا۔ بلکہ ہوئی دل سے بھگوان

کوکہہ رہی تھی، پربھو! جو میری قسمت ہو کرو. مگر میرے پتی دیو کو اس گناہ سے بچاؤ۔

ساری رات گذر گئی. دوسرے دن بھی میں اپنی جگہ سے نہ ہلی. میں نہیں جانتی کہ اس جاگنے کی اور اس برت کی مجھے کون طاقت دے گیا تھا جو میں اس پتھر کے بت کے ساتھ پتھر کی طرح بیٹھی رہی،

شام کے وقت کوئی باہر سے دروازے کو دھکا دینے لگا اور جس وقت لوگ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے. اسوقت میں بالکل بے ہوش تھی۔

جب میری بے ہوشی دور ہوئی. تب میں نے سُنا۔

"بہن!" میں نے دیکھا. کہ میں موہنی کی گود میں سوئی ہوئی ہوں. سر ہلاتے ہی اس کی ریشمی ساڑھی گھس گھس کی آواز پیدا کرنے لگی. میں نے سمجھ لیا کہ اس کی شادی ہوگئی ہے. دل ہی دل میں میں نے کہا —— پرماتما! تم نے میری کوئی پرارتھنا نہیں سُنی. میرے سوامی کا زوال ہوگیا!

چندر کلا نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

"بہن! میں تم سے آشیرباد لینے آئی ہوں؟"

پہلے تو عمر بھر کے لئے جیسے میں پتھر کی ہو گئی. مگر پھر بھی میں جلدی سے اٹھ کر سنبھل بیٹھی. اور بولی —— "کیوں! میں تمہیں آشیرباد کیوں نہ دونگی اس میں تمہارا قصور ہی کیا ہے؟"

موہنی اپنی مسکراہٹ بھری آواز سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑی اور مجھے ہلاتے ہوئی بولی۔

"کیوں جی! جب تم نے شادی کی تھی. تب تو کوئی قصور نہیں ہوا! اور میں نے کیا تو قصور ہو گیا؟"

موہنی کو زور سے گلے سے لپٹا کر میں ہنس پڑی. میں نے دل ہی دل میں کہا کیا دُنیا میں میری پرارتھنا ہی سب سے بڑھ کر ہے؟ کیا ان کی خواہش بھی

اس سے بڑھ کر نہیں ہے۔ جو مصیبت آ رہی ہے۔ وہ میرے سر پہ ہوگی۔ مگر میں اس مصیبت کو اپنے دل کی اس جگہ پہ نہیں ٹھہرنے دوں گی۔ جہاں میرا دھرم اور اعتبار رہتا ہے۔ میں جیسی تھی۔ ویسی ہی رہوں گی؛

موہنی نے میرے پاؤں پر گر کر میری خاک پا لی۔ ... پھر بناتے ہوئے کہا۔

"تم ہمیشہ سہاگیہ وتی رہو۔ سدا خوش و خرم رہو"

محض آشیرباد سے ہی کام نہ چلے گا۔ تم ستی ہو۔ تم اپنے ہاتھ سے میرا اور اپنے بہنوئی کا ہاتھ ملا کر دعا دو۔ ان سے شرم و لحاظ رکھ کر کام نہ چلے گا۔ اگر مجھے اجازت ہو تو میں انہیں یہاں لیتی آؤں۔

"لے آؤ" لرزتی ہوئی زبان سے میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ کسی نے گہرے پریم بھرے دل سے مجھے پکارتے ہوئے کہا۔

"کسم! خیریت سے تو ہو"؟

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اور پاؤں پر نمسکار کر کے بولی۔

"ہاں بھیا!"

"بھیا کس طرح ہوئے۔ یہ تو تمہارے چھوٹے بہنوئی ہیں"

موہنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اب سب بات میری سمجھ میں آگئی۔ میرے بھیا نے قسم کھائی تھی۔ کہ میں ساری عمر شادی نہ کروں گا۔ میری ماں تو تھی نہیں۔ جو مجبور کر کے ان کی شادی کرتی۔ اس وقت میں نے ہی ان کی شادی کروادی۔ میری دونو آنکھوں سے آنسو بھر بھر بہنے لگے۔ اور رکنے میں آتے ہی نہ تھے۔ بھیا شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ پھیر رہے تھے۔ موہنی مجھ سے لپٹ کر ہنس رہی تھی؛

رات کے وقت مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس وقت سے ہی اُچاٹ دل سے

میں اپنے پتی دیو کا انتظار کر رہی تھی۔ میں کچھ بھی نہ سوچ سکی کہ اس شرم اور بے عزتی کو کس طرح برداشت کروں گی!

بہت رات گئی، کواڑ کھلے۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔ وہ میرے سوامی کے پیروں کی آہٹ تھی۔ میرا کلیجہ اندر سے دھڑکنے لگا!

سوامی میرے پلنگ پر آ بیٹھے۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولے۔

"تمہارے بھیا نے میری مدد کر دی۔ میں لمحہ بھر کی اُلفت کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ اس دن جب میں کشتی پر بیٹھا تھا۔ تب میرے دل پر جتنا بوجھ تھا۔ اسے انتریامی ہی جانتے تھے۔ جس وقت میں درمیان میں آندھی سے گھبرا گیا۔ تب اس وقت مجھے جان کا خطرہ تھا۔ مگر ساتھ ہی سوچتا تھا کہ اگر اس وقت یہاں سے گر کر ڈوب جاؤں تو بیڑا پار ہو جائے۔ بُوا کے گاؤں پہنچ کر میں نے سُنا۔ کہ مجھ سے ایک دن پہلے تمہارے بھیا سے موہنی کی شادی ہو چکی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس وقت میں کتنی شرم اور مسرت سے کشتی پر واپس آیا ان دو چار دنوں میں ہی میں نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی ہے۔ کہ تمہیں چھوڑ کر مجھے اور تسلی نہ مل سکے گی۔ تم میری دیوی ہو!"

میں نے ہنس کر کہا۔ "تمہیں! مجھے دیوی بنانے کی ضرورت نہیں میں تمہارے گھر کی داسی ہی رہوں گی۔ میں محض ایک عورت ہوں!"

"تمہیں بھی ایک بات ماننا ہو گی۔ کہ آئندہ مجھے کبھی دیوتا نہ کہنا۔"

دوسرے دن میرے ہاں بڑی دھوم دھام سے جلسہ ہوا۔ اور موہنی میرے پتی دیو کے ساتھ کھاتے، پیتے، اٹھتے، بیٹھتے صبح و شام کی طرح مذاق کرتی اُن کے ہنسی ٹھٹھا کی حد نہ رہی۔ مگر کبھی کسی نے آ کر اس بات کا ذکر تک نہ کیا۔ کہ میرے سوامی کہاں گئے، کیوں گئے؟

ناکام محبت

کالج کی چار دیواری میں تحصیل علم کے دلدادہ میرے ہم سبق دوست مجھے نظر توقیر سے دیکھتے تھے۔ گویا خاص طور پہ تعریفی نگاہوں سے میرے تمام ہم سبق دوست مجھے تمام باتوں میں خود سے زیادہ سمجھدار خیال کرتے تھے؛

حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی چیز چھپائی نہیں جا سکتی؛

اس کا بڑا باعث یہ تھا کہ تمام امورات میں خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط میرا صرف ایک مستقل ارادہ تھا۔ اس دنیا میں زیادہ لوگ ہر ایک موضوع پر زور دے کر "ہاں یا نہ" نہیں کہہ سکتے۔ لیکن مجھ میں یہ خاص قوت مکمل مقدار میں موجود تھی۔ انوکھا پن دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن ہی جاتا ہے؛

ہر ایک موضوع پر میں صرف اپنے عقیدے کا اظہار ہی نہیں کرتا تھا بلکہ خود ہی مضمون نگار تھا۔ نظم کہتا تھا۔ تقریریں جھاڑتا تھا اور ہم سبق دوستوں کے درمیان تشریف فرما کر طرح طرح کے سوالات اور افسانوں پر تنقیدات بھی کرتا تھا۔ انہیں باتوں کے باعث میرے ہم سبق دوستوں میں سے چند لوگ تو مجھ سے جلا کرتے تھے۔ اور چند لوگ مجھے نظرِ عقیدت سے دیکھتے تھے۔ دنیا کے لوگ متضاد خیالات و اشکال کے مالک ہیں۔

پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں؛

کالج میں۔ کالج کی آخری منزل یعنی آخری امتحان پاس کرنے کے وقت

تک سابق کی طرح اپنے وقار کو برقرار رکھتے ہوئے کالج چھوڑنے ہی والا تھا لیکن اسی دوران میں میری راس کا مشہور مالک دیوتا شنیچر ایک پروفیسر کی شکل بنائے کالج کی چار دیواری میں نمودار ہوا … اُمید کے سلسلہ روانی میں قدرت کی دست اندازی کوئی نئی بات نہیں ہے۔

ہمارے وہ نئے اُستاد آج کل کے ایک شہرہ آفاق انسان ہیں۔ اور اگر میں اپنی امن جیون کہانی میں اُن کا نام پردہ راز میں رکھوں۔ تو بھی اُن کے جگمگاتے نام کی کچھ زیادہ کمتری نہ ہو گی۔ لیکن اپنی طرف سے میں ان کے اخلاق قلم بند کر کے اس افسانہ میں اُن کا "بانکے بہاری" کے نام نامی و اسم گرامی سے کروں گا۔ کیونکہ زیادہ عقل کا مالک ایک نافنا اصولی خیال رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔

اُستاد جی کی عمر ہم لوگوں سے کچھ بڑی نہ تھی۔ چند روز ہی گذرے تھے کہ اُنہوں نے ایم۔ اے کا امتحان بڑھتی ہوئی شہرت میں پاس کر کے ڈگری حاصل کی تھی۔ گویا کالج چھوڑا تھا۔ لیکن برہم سماجی ہونے کے باعث پاکی اور میب سے ہم لوگوں سے بالکل ہی جدا معلوم ہوتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ہم جولی یا ہمارے وقت کے آدمی ہی نہیں ہیں۔ وہ ہم لوگوں سے نہ تو زیادہ ملتے جلتے اور نہ ہی بڑھ کر گفتگو کرتے تھے۔ عہد گذشتہ کے انسانوں کی طرح وہ سنجیدہ مزاج رہتے تھے۔ ہم آپس میں اُنہیں برہم راکھش کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ گویا توضیح اوقات کے لئے ہمارے درمیان ایک ایک مشغلے نے مذاقیہ سامان پیدا کر دیا ہو۔

ہم لوگوں کی ایک انجمن مناظرہ تھی۔ اس انجمن کا سرکردہ مختار کار میں ہی تھا۔ انجمن مناظرہ کے تمام ممبروں کی تعداد چھتیس کے ہندسہ پر موقوف تھی۔ اگر انجمن مناظرہ کے پینتیس ممبروں کو نکال بھی دیا جاتا۔ تو انجمن کا کوئی خاص نقصان نہیں ہو سکتا تھا۔ اور صرف ایک مخصوص ممبر کی قابلیت کے

کے بارے میں جو میرا خیال تھا۔ ویسا ہی انجمن مناظرہ کے باقی پینتیس ممبروں کا بھی۔ گویا تمام انجمن مناظرہ ہم خیال تھی۔ اور ایسا ہونا بھی میرے الوکے پن کی مکمل مقدار والی قوت پر منحصر تھا!

انجمن مناظرہ کے سالانہ جلسہ میں پڑھ کر سنانے کے لئے میں نے ایک عجیب وغریب مضمون لکھا۔ اس میں میں نے کالائل پر تنقید کی تھی مجھے یقین کامل تھا۔ کہ اس کی رنگین کاری سے سامعین وجد میں مضطرب ہو کر جھوم اٹھیں گے۔ وجد میں آجانے کا بڑا سبب یہ تھا کہ اپنی اس تحریر میں میں نے ابتداء سے کر انتہا تک گویا آغاز تا انجام کالائل کی ہجو کی تھی۔ دل کھول کر کوسا تھا۔ ایسا کہ کالائل بیچارہ بھی گوشہ لحد میں پڑا سٹ پٹایا ہوگا!

انجمن مناظرہ کے اس سالانہ جلسہ کے صدر ہمارے وہی نئے پروفیسر بانکے بہاری تھے جب میں اپنا مضمون پڑھ کر سنا چکا۔ تب میرے ہم سبق اور عقیدت مند دوست میرے عقیدے کے تعجب خیز حوصلے اور میری انگریزی کی صفائی و سلسلہ روانی پر شیدا ہو کر نہایت خاموشی سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میرے مضمون کے بارے میں کوئی کچھ کہنا نہیں چاہتا یہ معلوم کر کے بابو بانکے بہاری کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے نہایت نرمی سے سنجیدہ آواز میں بے حد مختصر طور پر سب کو یہ سمجھا دیا۔ کہ امریکہ کے مشہور عالم ادیب لاویلی صاحب کے مضمون سے جس قدر مواد چرایا گیا ہے۔ وہ بہت ہی دلکش ہے اور جس قدر مضمون نگار نے خود تحریر کیا ہے۔ وہ اگر نہ لکھا جاتا۔ تو بہت ہی بہتر ہوتا۔ "تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں" کا مقولہ کس حقیقت نگاری قلم کا بے اثر نتیجہ نہیں ہے

اگر ماسٹر جی اس طرح فرماتے۔ کہ لاویلی صاحب کے ساتھ اس نے مضمون نگار کا عقیدہ اور زبان دانی کا بھی تعجب خیز ناممکن کے

برابر دکھائی دیتا ہے۔ تو ان کا فرمانا سچ بھی ہوتا اور سب جھوٹ نہ سمجھا جاتا مگر وہی ہوتا ہے جو ایشور چاہتا ہے۔ جب کہ انسان جدا جدا ہیں۔ تو اُن کے عقل خانے کیسے یک رنگ ہو سکتے ہیں؛

میرے ہم سبق دوستوں کی جو امرِ عقیدت مجھ پر تھی۔ وہ اس اتفاقیہ واردات کے بعد کچھ کم ہونی شروع ہو گئی۔ لیکن میرے دل رُبا عقیدت مند دوست موتی لال کی عقیدت میں کچھ بھی کمی واقع نہ ہوئی۔ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ کہ کیوں نہیں تم اس برہم راکھشس کو اپنا ودیا پتی ناٹک سنا لیتے۔ دیکھیں تو سہی وہ حاسد چہرہ اس کے بارے کیا کہتا ہے۔ گویا موتی لال جہاں استاد جی کے لئے پھانسی تیار کر رہا تھا۔ وہاں میرے لئے میدانِ مناظرہ اور خود ایک تماشائی کی حیثیت سے ہم دونوں کا عملی ناٹک دیکھنے کی آرزو رکھتا تھا۔ ایسا خیال کرنا دوست اور وہ بھی عقیدت مند دوست کی عقیدت پر شبہ کرنے کے مترادف تھا؛

راجہ شیو سنگھ کی رانی پنا کو کوی ودیا پتی بہت چاہتے تھے۔ اور رانی کے دید کے بغیر شاعری نہ کر سکتے تھے۔ اسی بنیادی خیال پر میں نے ایک پُر درد اور اعلےٰ درجے کا سنگیت ناٹک تصنیف کیا تھا۔ میرے سامعین دوستوں میں جو لوگ کسی بات میں بھی تواریخ کے اصولوں کی خلاف ورزی کرنا نہیں چاہتے۔ وہ کہتے تھے۔ کہ تواریخ میں کہیں بھی اس واردات کا ذکر نہیں ہے میں اس بات کے جواب میں کہتا تھا۔ کہ تب تو اسے تواریخ کی بدقسمتی کہنا چاہیئے۔ اگر تواریخ میں اس واردات کا ذکر رہتا تو وہ اور بھی زیادہ دلچسپ ہو جاتی۔ "جیون کا بیڑا آپار ہے بابا" ٹوٹے ہوئے جیلے پر گانے والے درویش کا یہ گیت عبیر ... کی مکمل مقدار والی قوت کا مظہر جو تھا؛

میرا یہ ناٹک بھی بیان کر چکا ہوں کہ میرا ناٹک اعلےٰ درجہ کا تھا۔ موتی کا خیال تھا کہ وہ اونچے درجہ کی تصانیف میں سے ایک ہے۔ کالیداس کے "شکنتلا" سے بھی

بڑھا چڑھا ہے۔ میں خود کو جتنا سمجھتا تھا۔ وہ اُس سے بھی زیادہ مجھے سمجھتا تھا۔ اسی وجہ سے میں بھی یہ اندازہ کرنے سے قاصر تھا۔ کہ میری قابلیت کی کیسی مکمل تصویر اُس کے دل پر نقش ہے۔ غیب کی باتیں جاننا اس وقت میرے لئے بے حد ضروری تھا؛

بانکے بہاری لال کو اس ناٹک کے سنانے کا مشورہ مجھے بھی کچھ برا محسوس نہ ہوا۔ کیونکہ اس ناٹک میں کوئی بھی قابل ہجو بات یا غلطی نہ تھی۔ کم از کم میرا تو یہ پختہ یقین تھا۔ انجمن مناظرہ کا ایک جلسہ خاص طور پر کیا گیا۔ کالج کے طلبہ کے سامنے میں نے اپنا ناٹک پڑھا۔ اس کے بعد بانکے بہاری لال اس پر تنقید کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اور سب اس بات کی انتظار کرنے لگے۔ کہ دیکھئے اب اس پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے؛

اس تنقید کو میں اس جگہ مکمل طور پر ظاہر کرنا۔ مختصر طور پر اتنا کہہ دینا ہی درست ہوگا کہ تنقید میرے پسند ہی نہ تھی۔ تنقید کرنے والے کی رائے میں ناٹک کے اداکاروں کے کریکٹر اور روحانی نمائش میں کوئی نا دیدہ خصوصیت نہیں دکھلائی گئی تھی۔ اس میں طوالتی گفتگو کو سادہ پن کی زیادتی تھی لیکن وہ باتیں بھاپ کی طرح گرم نہیں۔ تنقید کرنے والے کا کہنا تھا۔ کہ ڈرامہ نگار کے دل میں صورت اور زندگی سے دو چار ہو کر اس سے وہ باتیں نہ نکلی تھیں اگر اس وقت میرا دل یہ کہہ اُٹھتا۔ "کہ اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی" تو یہ بات میرے اخلاق پر اثر انداز نہ ہوتی۔ کیونکہ اس مقولے کا اظہار بہت خاموشی سے میرے دل ہی دل میں ہوتا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ اسلئے مجھے بے حد خوشی ہے؛

بچھو کی دم میں ہی ڈنگ ہوتا ہے۔ بانکے بہاری کی تنقید کے ابتدائی حصہ میں بھی کافی زہر بھرا ہوا تھا۔ تشریف رکھنے سے پیشتر ہی انہوں نے کہا۔ اس ناٹک کے بہت مناظر اور ناٹک کا خصوصی حصہ گیلئے کے "نام سے" ناٹک سے اخذ

کیا گیا ہے۔ کسی کسی جگہ پر وہی اور کسی کسی جگہ پر ترجمہ کر دیا گیا ہے ہمت کرنے سے کیا نہیں ہو سکتا۔

اس بات کا ایک بہترین جواب تھا۔ میں کہہ سکتا تھا۔ کہ یہ بُری بات نہیں۔ علم ادب کی دُنیا میں چوری بھی ایک بڑی زبردست تعلیم ہے۔ یہاں تک کہ اگر چوری پکڑ بھی لی جائے۔ تو اس کی وجہ سے چور کی عزت میں داغ نہیں لگنے پاتا۔ علم ادب کے بڑے بڑے سرمایہ داروں نے یہ کام کیا ہے۔ مشہور مصنف بھی اس کام میں نئے نہیں ہیں۔ علم و ادب میں وہی چوری کرنے کا حوصلہ کر سکتا ہے۔ جس میں کافی سے زیادہ عادت ہو۔ کیونکہ وہ دوسرے کی چیز کو مکمل طور پر نہیں بنا سکتا ہے۔

اور بھی بہت سی بہترین باتیں تھیں۔ لیکن اس روز میں نے کچھ نہیں کہا۔ اس کا باعث میری شاگردی یا عاجزی نہ تھی۔ پانچ سات دن کے بعد یکے بعد دیگرے ایسے جوابات اُمنڈتے ہوئے بادلوں کی طرح میرے دل میں پیدا ہونے لگے۔ لیکن دشمن کی عدم موجودگی میں وہ ہر طرف سے مجھے ہی مجروح کرنے لگے۔ میں نے سوچا کم از کم یہ باتیں اپنی جماعت کے طلبہ کو سنا دینی ٹھیک ہوتی۔ لیکن مجھے سے یہ تمام جوابات میرے ہم سبق گدھوں کی عقل کے لئے کچھ زیادہ لطیف تھے۔ اُن کی سمجھ میں چوری کا نام ہی بُرا تھا۔ میری چوری میں اوروں کی چوری میں کس قدر امتیاز ہے۔ ایسا سمجھنے کی قدرت اگر ان میں ہوتی۔ تو ان کے ساتھ میرا زیادہ اختلاف رائے نہ ہوتا۔ منہ اپنا اپنا عقل اپنی اپنی۔

بی۔ اے کا امتحان دیا۔ اس میں مجھے ذرا بھی شک نہ تھا۔ کہ میں پاس ہو جاؤں گا۔ لیکن پھر بھی میرا دل پژمردہ تھا۔ یا مجھے ماسٹر جی کی ان باتوں کے دھکے سے میری تمام شہرت اور فلک تمنا کو چھو لینے اور ہمکنار کر دینے والی عمارت سے پکنا چور ہو گئی۔ شہرت بے سمجھی ہوتی۔ دل کی عقیدت تو بھاگتی

کسی طرح بھی کم نہ ہوئی۔ پربھات میں جبکہ خورشید شہرت میرے مقابلہ
میں طلوع ہو رہا تھا۔ اسی وقت بھی وہ عقیدت لامحدود ٹھنڈی چھایا کی
طرح میرے پاؤں سے لگی ہوئی تھی۔ اور شام کے وقت جب خورشید شہرت
میرے عقب کی طرف غروب ہونے لگا۔ اس وقت بھی اس عقیدت نے
چھایا کی طرح میرے قدموں کو نہیں چھوڑا۔ لیکن اس عقیدت سے کسی
طرح کی شانتی بھی نہ ہوتی تھی۔ میرے خیال میں شاید وہ کم عقل عقیدت
مند کے دل کی اُلفت آمیز تاریکی تھی۔ عقل کی نورانی شعاؤں کا جلوہ تھا
"تم کچھ بھی ہو لیکن میرے ہو" ایسا موتی لال کے دل کا اندرونی پہلو تھا
جسے میں ہی سمجھ سکا۔ لیکن اس کی یہ بات پسند نہ کرتا ہوا بھی اپنی
ناپسندیدگی کا اظہار نہ کر سکا۔ کیونکہ اندھی عقیدت والے دوست کی دل
شکنی کرنی مجھے پسند نہ تھی۔ اور میں ایسا کر ہی کیسے سکتا تھا؟

میرے والد شریف منشی برج بالی لال صوبہ بہار کے ایک نامی وکیل
تھے۔ میری شادی کے لئے ہر روز گھر میں گفتگو ہو رہی تھی؛

والد صاحب نے خط ارسال کر کے مجھے گھر میں طلب کیا۔ میں نے جوابی
صورت میں تحریر کر دیا — "افسوس کہ میں آ نہیں سکتا؛

کیونکہ اسوقت میرے اس کام سے میری تعلیم میں نقصان ہونے کا
سخت اندیشہ ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ آپ میری شادی کے بارے میں اس
قدر جلدی نہ کریں۔ کالج کی تعلیم کو ختم ہو جاتے دیکھئے۔ یہی میری عرض ہے
والدین کی حکم عدولی گناہ ہے۔ لیکن سچائی کو چھپانا گناہ کبیرہ،

دراصل بات یہ تھی کہ اس وقت میرا دل ٹھکانے نہ تھا۔ میرے دل میں
بھی اس تنقید سے ایک طرح کی خلاف ضمیر یعنے خود میں ہی ایک طرح کی
اُلجھن پیدا ہو گئی تھی۔ مجھ پر تنقید کرنے والے کا مواد میرے فن نویسی کے
مواد کو خفیہ طور پر ذک پہنچا رہا تھا۔ میرا فن نویسی کا مواد کہتا تھا کہ اس کا

انتقام لوں گا۔ ایک مرتبہ پھر لکھوں گا۔ تب دیکھوں گا کہ میں بڑا ہوں یا مجھ پر تنقید کرنے والا بڑا ہے ۔۔۔ ذرا آنے تو دو مقابلے کی میز پر!

میں نے ایسا یقین کر لیا۔ کہ ایک سے محبت اور دوسرے کیلئے روحانی نفرت ۔۔۔ دشمن کو معاف کرنا ۔۔۔ وغیرہ ان خیالوں کو لے کر ایک کمال درجہ کا عجیب طور پر کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ تنقید کرنے والوں کے لئے ایک خاص خوراک جمع کروں گا۔ ہمت کرنے سے کیا ہو نہیں سکتا۔ "وہ کون سا عقدہ ہے جو واہ ہو نہیں سکتا؟"

خیال کیا کہ دل کش تنہا مقام پر بیٹھ کر اپنی زندگی کی اس بلند طبقہ کار گذاری کی جائے۔ اور قسم کھائی کہ کم از کم ایک ماہ تک گھر سے دوستوں واقف کاروں اور غیر واقفیت رکھنے والوں، گویا کسی سے بھی ملاقات نہ کرونگا "پران جائیں پر بچن نہ جائی"

موتی لال کو بلا کر میں نے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔ وہ یک بارگی سناٹے میں آگیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اس نے اسی وقت میری پیشانی سے میری قسمت دیکھ لی ہو۔ پھر سنجیدگی سے میرا ہاتھ دبا کر اُس نے نہایت دھیمی آواز سے کہا۔ بھائی ہمیشہ کی شہرت اور غیر فانی عزت حاصل کرو ۔۔۔ عقیدت مندوں کی دعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ سنتے ہی میرے جسم میں کپکپی شروع ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے شہرت کے آسمان پر اُڑا جا رہا ہوں!

موتی لال نے بھی کچھ کم روحانی بلیدان نہیں کیا۔ اُس نے وطن کی بہبودی کے لئے کامل ایک ماہ تک میرے ساتھ رہ کر آرام کو چھوڑ دینا تسلیم کر لیا۔ ایک سرد آہ بھر کر وہ مجھ سے جدا ہوا۔ اور ٹرام پر سوار ہو کر بڑے بازار میں واقع اپنی کمین گاہ میں چلا گیا۔ ادھر میں گنگا تٹ پر ۔۔۔ انگاپرہ واقع ایک باغ میں دھونی رما کر غیر فانی شہرت اور اپنی عزت کو حاصل کرنے کے لئے تیاری کرنے لگا الوالعزم دانشمند جب کر لے پر آتے ہیں۔ سمندر پھاڑ دیتے ہیں کوہ سے دریا

بہاتے ہیں۔

گنگا کے کنارے غیر آباد مکان میں نہایت بے فکری سے لیٹ کر... خدا سے محبت کے بارے میں سوچتے خیال کرتے کرتے دوپہر کے وقت نیند آجاتی تھی۔ اور اس کے بعد تیسرے پہر شام پڑنے سے عرصہ پیشتر آنکھ کھلتی تھی اور بعد ازاں تمام جسم میں ایک طرح کی سستی سی محسوس ہوتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح دل بہلانے اور توضیح اوقات کے لئے میں باغ کے عقب میں سڑک کے کنارے ایک کرسی ڈال کر نہایت خاموشی سے بیٹھے بیٹھے بیل گاڑیوں اور انسانوں کی آمد و رفت دیکھا کرتا تھا۔ اور جب دل بہت گھبراتا تھا تو قریب کے سٹیشن پر جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہاں تاریکی کھٹ کھٹاہٹ ہوتی تھی۔ ٹکٹ تقسیم ہونے کی گھنٹی بجتی تھی۔ مسافر آتے تھے۔ سرخ سرخ آنکھیں نکالے ہزار پاؤں والے کیڑے کی طرح ریل گاڑی پھنکارتی آتی اور دور سے سیٹی بجا کر گرجتی ہوئی بھاگ جاتی تھی۔ میں اسٹیشن سے واپس اپنی آرام گاہ کو لوٹ آتا تھا کسی ہمراہی کے نہ ہونے کی وجہ سے سر شام ہی کھانا تناول کر کے سو رہتا تھا۔ صبح جلدی اٹھنے کی غیر ضروری وجہ سے بستر استراحت کو نہ چھوڑتا تھا۔ یہی میری محنت تھی۔ اور اسی محنت کے پھل کی آرزو میرے دل میں تھی۔ لیکن کیا یہ سب کچھ ٹھیک تھا؟

اس عمل سے جسم پتھر ہو گیا۔ اور بھگوان سے محبت کا کچھ پتہ نہ چلا۔ عالم تنہائی میں رہنے کی مشق نہ ہونے کی وجہ سے گزشتہ تنہائی یعنی گنگا تٹ غیر آباد قبرستان کی طرح معلوم ہونے لگا۔ سوتی تال میں ایسا کرتا تھا کہ ایک دن کے لئے بھی اس نے اپنی قسم نہ توڑی۔ عقیدت میں کس قدر سچا رہنے پر بھی کی یاد کا سحر بھی اس پر جادو نہیں کرتا!

اس سے پہلے جب شہر کے عین درمیان میں رہتا تھا تب سوچا تھا کہ گھنے سایہ دار برگد کے نیچے پاؤں پھیلا کر بیٹھوں گا۔ قدموں کے قریب

ہی نغمہ ترنم گاتی گنگنا اپنی موج میں بہتی رہتی گی۔ بیچ میں مست خیال شاعر ہوگا۔ اور اس کے ارد گرد تصوری حکومت اور برہنہ قدرت اعظم ہوگی برگد کے درخت میں پھول ڈال کر لٹکان خوش لٹا اور آسمان میں ستارے ہوں گے۔ گویا دل میں خدا سے محبت۔ اور وہاں نہ قلم ہیں بے پردہ خیالات کے بہاؤ کی آبشار ہوگی۔ لیکن اس وقت کہاں ہے قدرت اور کہاں ہے قدرت کا شاعر کہاں ہے خدا اور کہاں ہے اس کا عاشق۔ ایک دن کے لئے بھی میں باغ میں داخل نہیں ہوا۔ درخت کے پھول درخت میں کھلتے تھے ڈالی پر بیٹھنے والے پرندے ڈالی پر بیٹھے رہتے ہیں۔ آسمان کے ستارے آسمان میں چمکتے رہتے۔ برگد کے درخت کی چھاؤں برگد کے نیچے ہی پڑی رہتی تھی اور میں باغیچہ میں بنے ہوئے گھر کے اندر ہی پڑا رہتا تھا۔ یہی تھے میرے شب روز کے اشغال۔

اپنے دفتر کو کسی صورت میں بھی بے عزت نہ کرنے کی وجہ سے بانکے بہاری کے خلاف میرا اظہار عداوت روز بروز بڑھنے لگا —— قدرتی بات غیر قدرتی کیسے بن سکتی ہے ؟

اس وقت بچپن کی شادی کے خلاف اور حق میں کلکتہ کے شہرو آفاق اخبارات میں بہت بڑے طویل مضمون شائع ہو رہے تھے۔ بانکے بہاری لال بچپن کی شادی کے خلاف تھے۔ ایسی ہی ایک اڑتی خبر میرے کانوں میں پہنچی۔ کہ وہ ایک پرشباب دوشیزہ سے محبت کرتے ہیں۔ اور انہیں امید کامل ہے کہ بہت جلدی اُن کی شادی اس کے ساتھ ہو جائے گی ایسا بھی معلوم ہوا۔ کہ وہ دوشیزہ ایک برہم سماجی بنگالی کائستھ کی دختر نیک اختر ہے —— دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔

صوبہ بہار کے کائستھ کا بنگال کے کائستھ کی لڑکی سے عقد کرنے کا ارادہ مجھے بہت تعجب خیز اور پُر سحر دکھائی دیا۔ میں نے بیٹھے ہی بیٹھے بانکے بہاری

کو مخاطب کر کے پھر دل میں آسے سخت و سست کہا۔ اس مکان کو چھوڑ کر ساتھ
شہر والے مکان میں جانے کا خیال کیا۔ اسی دوران میں ایک ایسی واردات
ظہور پذیر ہوئی۔ کہ یہ خیال مجھے تبدیل کر دینا پڑا۔

ایک روز اسٹیشن کی بجائے میں باغیچہ کی سیر میں مشغول ہو گیا۔ عدم
فرصت کی وجہ سے تا حال میں نے باغیچہ کی کوئی چیز نہ دیکھی تھی۔ اور اگر
خدا لگتی بات پوچھو تو وہ یہ ہے۔ کہ ان دنوں بیرونی اشیاء پر میری توجہ
بھی نہ تھی۔ اس روز جسمانی تھکاوٹ اور کاہلی کی وجہ سے گویا دل کی خرابی کے
باعث ہوا میں تیرتے ہوئے سوکھے پتے کی طرح میں باغیچہ میں ادھر اُدھر
چہل قدمی کرنے لگا؛ بچہ

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

صرف خیال ہی اچھا نہیں، بلکہ عمل بھی بہتر ہے!

باغیچہ کی شمالی دیوار کے قریب جا کر جامن کے درخت کی آڑ میں میں
نے دیکھا کہ تھوڑی دور پر ایک چھوٹا سا بنگلہ ہے۔ اسی باغیچہ میں سولہ یا
سترہ برس کی حسین و جمیل دوشیزہ ہاتھ میں کتاب لئے سر جھکائے چہل
قدمی کرتے ہوئے مطالعہ میں مشغول ہے۔ ایک ادائے مستانہ سر سے پاؤں
تک چھائی ہوئی ہے۔

عین اسی وقت کسی راجہ کے خواہش کرنے کی قوت میرے جسم سے مفقود
تھی۔ لیکن چند روز کے بعد میں نے خیال کیا تھا۔ کہ ایک وقت دشرت
راجہ بڑے بڑے تیر و کمان لے کر رتھ پر سوار ہو کر جنگل میں شکار کرنے آئے
تھے۔ ہرن تو مرا نہیں۔ مگر اسی طرح شجر کی آڑ میں جو کچھ انہوں نے دیکھا
شکار کی آرزو کے خلاف اُن کا دل ہی مجروح ہو گیا۔ میں بھی کاغذ قلم لے کر
شاعری کا شکار کرنے چلا تھا۔ ایشور پریم نے تو بھاگ کر اپنی جان بچا ہی لی
تھی۔ لیکن جامن کے پیڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کر میں نے جو کچھ دیکھا۔ اس سے

میرا دل عشق کا شکار ہو گیا۔

صفحۂ دنیا کی خاک پر آکر میں نے بہت سی چیزیں نہیں دیکھیں جہاز پر سیر کرنے کے لئے سوار نہیں ہوا۔ ہوائی جہاز پر نہیں چڑھا۔ کوئے کی کان میں نہیں اترا۔ لیکن اس جگہ آنے سے پیشتر مجھے یہ خیال نہ تھا۔

میری عمر تقریباً اکیس بائیس برس کی ہو گی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اتنے عرصہ میں میں نے تصور کی دنیا میں کس حسین دوشیزہ کا خیال کر کے اپنے دل میں ایک قابل تصویر نقش کر لی تھی۔ اور اسے شنگار اور سرا پا زینت بنا کر دل میں رکھا تھا!

لیکن کبھی خواب میں بھی میں نے ہرگز یہ خیال نہ کیا تھا۔ کہ اس کے پاؤں میں جوتا اور ہاتھ میں کتاب دیکھوں گا۔ اور وہ لہنگے دوپٹے یا دھوتی کی بجائے میم صاحبوں کی طرح ایسی پوشش پہنے ہوئے ہو گی۔ نہ مجھے ایسی امید تھی اور نہ ہی ایسی طلب۔ لیکن خدا کی کارگزاریاں عجیب و لامحدود ہیں۔ ماہ پھاگن کے آخری دنوں میں تیسرے پہر کے وقت بڑے بڑے درختوں کے جھومتے ہوئے گہرے پتوں کی لمبی چھاؤں میں نور کی شعاؤں سے ہم آغوش اور گلہائے چمن کے عین درمیان پاؤں میں جوتا پہنے اور ہاتھ میں کتاب لئے انگریز لیڈیوں جیسا لباس زیب تن کئے میرے دل کو لوٹ لینے والی معبود، دیوی، نازک اٹھکیلیاں کرتی ہوئی نظر پڑی۔ میں کچھ نہ بول سکا!

حسین بت کی یک نظر دید نے مجھے ایک بے حرکت مجسمہ بنا دیا۔ دو منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ وہ دوشیزہ بنگلہ کے اندر جا کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے اس کو پھر سے دیکھنے کے لئے خوب تانک جھانک لگائی۔ لیکن وہ دکھائی نہ دی۔ اسی روز پہلی مرتبہ گہری شام ہونے سے کچھ دیر پیشتر میں پاؤں پھیلا جامن کے نیچے بیٹھ گیا۔ گنگا کے دوسرے کنارے

درختوں کے اوپر گہری تاریکی میں چاند نکل آیا۔ میرے دل نے کہا — اہا اہا چاند نکل آیا — لیکن وہ زمین کا چاند مجسم دیوی!

وہ کتاب جسے میں نے دوشیزہ کے دست نازک میں دیکھا تھا۔ میرے لئے دنیا عالم کی تمام لطیف باتوں سے بڑھ کر پُر اسرار چیز بن گئی۔ میں خیال کرنے لگا کہ وہ کون سی کتاب تھی۔ کوئی ناول تھا یا دیوان۔ اس کی عبارت کن باتوں سے کس امور کی باتوں سے لبریز تھی۔ جو صفحہ کھلا ہوا تھا۔ اور جس کے اوپر تیسرے پہر کی چھایا اور آفتاب کی شعاعوں کے ساتھ ان دونوں آنکھوں کی پُر اسرار نظر پڑ رہی تھی۔ اس صفحہ میں ناول کا کونسا حصہ، نظم کا کون سا آب حیات مظہر تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی میں یہ خیال بھی کرنے لگا۔ کہ گہرے، گھنے اور کھلے ہوئے گیسوئے دراز کی اندھیری چھایا سے کھلے نازک انداز پیشانی کے مرکز میں تعجب خیز خیال کا جادو کس طرح جگا رہا تھا!

کتنی دیر تک یا آدھی رات تک پاؤں چھپے سے اسی طرح نہ جانے کتنی باتوں کا خیال اپنے دماغ میں کرتا رہا!

لیکن یہ مجھ سے کس نے کہا ہے کہ وہ [illegible] دوشیزہ ہے

اس کے جواب میں مجھے اتنا ہی کہنا کافی ہے۔ کہ مجھ سے بہت دن پہلے وسنت کو ملاقات کرنے سے پہلے ہی شکنتلا کے بارے میں جس نے کہا تھا اس نے مجھے بھی کہہ دیا۔ کہ وہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اپنے ہی دل کی آرزو ہے۔ وہ انسان سے جھوٹی اور سچی گویا بہت سی باتیں کہا کرتی ہے۔ کبھی اس کا کہنا سچ نکلتا ہے اور کبھی جھوٹ۔ لیکن وسنت سے اور مجھ سے ہر اس نے کہا۔ وہ سچ ہی کہا — دونوں ایک ہی مرض کے مریض تھے:

ایسا تو مجھے پیشتر ہی معلوم ہو چکا تھا۔ کہ وہ حسینہ ہندوستانی ہے یورپین یا اہل یورپ کی نسل سے نہیں، اندازے سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ

وہ کسی برہم سماجی بنگالی کی دختر نیک اختر ہے۔ ایسی خبر کا حاصل کرنا بھی میرے لئے دشوار نہیں تھا۔ کہ میری وہ ناواقف پڑوسن شادی شدہ ہے یا کنواری، براہمن ہے یا کائستھ۔ لیکن میں نے اس کے لئے کوئی کوشش شروع نہیں کی۔ نہایت خاموشی سے چکور جیسے سینکڑوں کوسوں کی دوری سے چاند کی طرف دیکھا کرتا ہے۔ ویسے ہی میں بھی بڑی دور سے چاند جیسے چہرے کو اس کے رخ مہتاب کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا،

دوسرے روز شام کو میں نے ایک کشتی کرائے پر لی۔ اس میں بیٹھ کر میں گنگا کی سیر کرنے لگا۔ ملاحوں سے کہہ دیا کہ چپو نہ چلاؤ۔ کشتی آزاد ہو کر اپنے بہاؤ کی طرف بہ چلی تھی۔

احسان ناخدا کا اٹھائے میری بلا

اسوقت میرا طرز عمل شاعری کے اسی شعر کی تکمیل کرنے میں مشغول تھا شکنتلا، عبادت گاہ والی جھونپڑی، جنگل یہ سب گنگا کے کنارے پہ ہی تھا۔ جھونپڑی ٹھیک طور پر "کنو" رشی کی جھونپڑی کی طرح نہ تھی۔ گنگا کے کنارے سے بنگلہ کے برآمدے تک برابر سیڑھیاں تھیں۔ اور برآمدہ ڈھلتی ہوئی چھپی چھت سے چھپتا ہوا تھا۔۔۔ قدرت کی گودی میں جدید قدرت کھیل رہی تھی؛

میری کشتی نہایت خاموشی سے اُس گھاٹ کے مقابل آئی۔ تب میں نے دیکھا کہ زمانے حال کی شکنتلا برآمدے میں زمین پہ فرو کشی ہے سامنے کی طرف ایک چوکی ہے۔ اس پہ چند کتابیں پڑی ہیں۔ ان کتابوں کے اوپر اسی کے گیسوئے دراز بکھرے پڑے ہیں۔ وہ اسی چوکی کا سہارا لئے منہ اوپر اٹھائے بائیں ہاتھ پہ سر رکھے بیٹھی ہے۔ کشتی سے اس کا رخ روشن دکھلائی نہ دیتا تھا۔ صرف اس کے نازک اندام صراحی دار گلے کی ایک طرف دکھائی دیتی تھی۔ اسوقت پاؤں میں جوتا نہ تھا۔ ایک پاؤں گھاٹ کے اوپر کی سیڑھی پہ

اور دوسرا پاؤں اس کے نیچے کی سیڑھی پر پھیلا ہوا تھا۔ دھوتی کا سیاہ کنارہ ایک موج آب کی طرح پاؤں سے لپٹا ہوا تھا۔ مطالعہ کے دوران میں نیند آ جانے کے باعث کتاب اس حسینہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی تھی مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا مجسم طور پر ساکشات لکشمی دیوی فروکش ہے۔

پاؤں کے نیچے گنگا، مقابل لامحدود کنارہ اور اوپر آفتاب کی تیز تر گرمی سے تپ رہا نیلا آسمان اسی دوشیزہ کائنات کی جانب انہیں دونوں کے قدموں کی طرف اسی قدرتی خیال کے اظہار کو آشکار کرنے والے بائیں ہاتھ پر سر کی طرف اور اس صراحی دار گردن کی ریکھا کی طرح نہایت اٹل یک سوئی قلب کے ساتھ خاموشی سے ٹکٹکی لگائے ہوئے ہے۔ جب تک وہ تصویر دکھائی دیتی رہی۔ تب تک میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

چلتے چلتے جب کشتی مُڑ کر نکل گئی۔ تو درمیان میں ایک درخت کے سدراہ ہو جانے سے اس دوشیزہ کی زندہ تصویر غائب ہو گئی۔ تب میں جیسے حالت خواب سے چونک اٹھا۔ میں نے ملاح سے کہا۔

"بس، اب اسی جگہ سے کشتی واپس لوٹائے چلو۔"

واپسی کے وقت کشتی کو بہاؤ کے خلاف چلنا تھا۔ اس لئے ملاح لوگ زور زور سے چپو چلانے لگے۔ اور اس وقت چپوؤں کی آوازیں جیسے میں خود ہی خود کو قابو کے لئے اپنے جسمانی اعضاء سے یک آغوش ہو جانے کی کوشش کرنے لگا۔ چپوؤں کی وہ آواز گویا اس طرح کسی انسان کو چوٹ پہنچانے لگی۔ جو چست نوجوان اور بہادر ہونے پر بھی ہرن کے بچے کی طرح خوف زدہ ہونے والا تھا۔ اور جب کشتی پھر لوٹ کر اس گھاٹ کے مقابل میں آئی۔ تب چپوں کی آواز سن کر اسی دوشیزہ نے سر اٹھا کر قدرے ہلے چینی کے ساتھ میری کشتی کی طرف دیکھا جھپکتی ہوئی ٹکٹکی اور مضطرب نگاہوں سے میری طرف دیکھتی ہوئی وہ اسی ثانیہ

میں اٹھ کر اندر چلی گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ گویا میں نے اُسے چوٹ پہنچائی ہو۔ اور اس کی طرف میرا یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا اُس کو اچھا نہیں لگا۔ شوخی سے میری شوخ نظر تلملا گئی؛

یکبارگی گھبرا کر اٹھتے ہوئے اس دوشیزہ کے ہاتھ سے ایک امرود کا پھل گر کر لڑھکتا ہوا نیچے کی سیڑھی کی طرف گرا۔ اس پھل پر دوشیزہ کے دو دندان سے کاٹ کے نشان بنے ہوئے تھے۔ اس قدر کٹے نیم بوسہ بز پھل کے لئے میرا دل بے حد بے چین ہو اٹھا۔ لیکن ملاحوں سے آنے والی شرم کے باعث میں اُسے اٹھا نہ سکا گیا۔ اس طرف دیکھتے دیکھتے میں اپنے مکان کے گھاٹ پر پہنچ گیا؛

گھر آکر میں اپنے جامن کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر تمام دن یہی خواب دیکھتا رہا۔ کہ وہ نازک کنول قدموں کے نیچے تمام کائنات کی کل قدرت سر جھکائے پڑی ہے۔ فلک نور پاشاں ہے۔ زمین پھلی پھولی ہے اور ہوا بھی چال مستانہ سے چل رہی ہے۔ انہوں کے درمیان رکھے ہوئے قدم نہایت خوب صورتی سے ساکن ہو کر تشریف فرما ہیں انہیں یہ معلوم نہیں۔ کہ انہیں کی آواز سے مست نوجوان موسم بہار ہر طرف مستی سے مستانہ وارگی بھرپور ہو رہا ہے؛

اس سے پیشتر میری نظروں میں قدرت ایک جیسی نہ تھی۔ ندی جنگل اور آسمان یہ سب کچھ جدا جدا خیال سے بھرے ہوئے تھے آج اس وسیع کائنات خیال کے درمیان ایک حسینہ کی زندہ تصویر دیکھتے ہی مندرجہ بالا تمام کائناتی پیداوار مجسم سے ہو کر یک جسم ہو اٹھے آج کی قدرت مجھے بہت ہی خوب صورت معلوم ہوئی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ روزانہ اشاروں سے مجھے یہ کہہ رہی تھی۔ کہ میں گونگی ہوں تم مجھے زبان دو۔ میرے دل میں جو ایک جوالا جل رہی ہے اُسے تم ترنم

شعر موسیقی اور تان کے ذریعے اپنی دل کش انسانی زبان میں آشکار کر دوں۔

آج قدرت کے اس حسن سے میرے دل کی ستار بج اٹھی۔ آج ہر مرتبہ مجھے صرف یہی گیت سنائی دیتا ہے۔ اے حسینہ! اے دل رُبا، اے ملکہ قدرت، اے دل کی طرح بنے ہوئے پروانے کی جیوتی، اے لامحدود زندگی، اے سراپا مستی،

آج میں اس گیت کو ختم نہیں کر سکتا۔ میں اس گیت سے دست کش نہیں ہو سکتا۔ آواز بلند کر کے صاف طور پر میں اُسے گا نہیں سکتا مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے دل کے اندر ایک قوت اُمنڈ رہی ہے میں اس کو اپنے قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ میں جب اپنی قوت کو قابو کر لونگا۔ تب گیت بلند ہوگا۔ میری پیشانی ایک منتخب تعجب خیز چمک سے جگ مگ کر اٹھے گی۔

اسی وقت ایک کشتی میرے باغ کے گھاٹ سے آ کر لگی۔ کوٹ پتلون زیب تن کئے موتی لال ہنستا ہوا اس کشتی سے اُترا۔ اپنے دوست کی غیر متوقع آمد کو دیکھ کر میرے دل میں جیسے اس خیال کا اظہار ہوا لیکن خیال کا جو شاید دشمن کے لئے نہ ہوگا۔ دو بجے تک ایک درخت کے نیچے مجھے پاگل کی طرح دیکھ کر موتی لال کو بڑی اُمید ہوئی۔ بھارت کے زمانہ مستقبل کی مقدس شاعری کا کوئی حصہ اس کے قدموں کی آہٹ سے چونک کر جنگلی ہرن کی طرح کہیں بھاگ نہ جائے۔ اس خوف کے مارے وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھے اور بھی غصہ آ گیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔

"کیوں موتی لال ——— کیا ہے۔ کیا پاؤں میں کانٹا لگ گیا ہے؟"

اس نے سمجھا میں نے ایک بڑے مزے کی بات دل لگی کے طور پر کہی۔

ہے ۔ وہ ہنستا ہوا میرے پاس آیا اور درخت کے نیچے کی زمین کو اپنے رومال سے صاف کرکے پھر اس پر رومال بچھا کر آرام سے بیٹھ گیا پھر اس نے کہا۔

" بھائی! تم نے تو بڑے مزے کا مضمون بھیجا ہے۔ میں تو پڑھتے پڑھتے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گیا "!

اس وقت اس کی طرف سے اس طرح کی ہنسی مجھے بے حد تکلیف دہ معلوم ہوئی۔ جس قلم سے میں نے وہ مضمون تحریر کیا تھا۔ وہ قلم جس پیڑ کی لکڑی سے بنی ہوئی تھی۔ اس پیڑ کو بیخ بن سے اکھاڑ کر اس کے ساتھ ہی آگ میں جلا دینے کی خواہش پیدا ہوئی؛

موتی لال نے جذبات کو روکتے ہوئے دریافت کیا۔

" وہ نظم کس قدر لکھی گئی "؟

اس کے اس سوال سے میرے جسم میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ جیسی تیری شاعری ویسی تیری عقل۔ میں نے خود پر قابو پا کر موتی لال سے کہا ۔۔۔ یہ گفتگو بعد میں ہوگی۔ اس وقت غپ شپ کو اس طرح چھوڑ کر میرے یک سوئی قلب کو مت بھگاؤ؛

موتی لال یکا یک بیٹھنے والا انسان نہ تھا۔ ادھر اُدھر دیکھے بغیر وہ نہ رہ سکتا تھا۔ اس دوران میں آہستہ سانس لے کر اس جگہ سے اُٹھ کر اندر چلا آیا۔

وہ تقریباً دس منٹ کئی ایک طریقوں سے تنگ کرنے کے بعد موتی لال واپس لوٹ گیا۔ جب تک موتی لال میرے پاس رہا۔ میں نے باغیچہ کے شمال کی طرف توجہ ہے۔ اس طرف قدم نہیں بڑھایا۔ ایک بخیل شخص جیسے اپنے خزانے کو چھپاتا ہے۔ ویسے ہی میں بھی اپنے خزانے کو موتی لال کی نظروں سے چھپاتا رہا۔ موتی لال کے واپس جاتے ہی میں ایک دم باغیچہ کے اس مقام پر پہنچا۔ جہاں سے اس دوشیزہ کے دیدار حاصل کرنے کی پر تمنا تمکنات

تھی۔ اوپر آسمان میں خورشید کی تپہ شفاف نورانی صورت تھی۔ نیچے شاخوں کے ذریعے سینہ بہ سینہ ملے ہوئے درختوں کی قطار کے پیچھے گہری شام کی قاتل شعاع کی جاذب تاریکی تھی۔ میں نے دیکھا تھا۔ وہ حسینہ اپنے بوڑھے باپ کا داہنا ہاتھ تھامے ہوئے نہایت آہستہ آہستہ چہل قدمی سے آگے بڑھتی ہوئی محو گفتگو ہے۔ بوڑھا الفت آمیز عقیدت کے ساتھ نہایت خاموشی سے دل لگا کر بیٹی کی باتیں سن رہا ہے اس مقدس الفت آمیز تذکرے میں رخنہ اندازی کرنے والی کوئی بات اس گوشہ تنہائی میں نہ تھی۔ گہری شام کے وقت ندی کے کنارے بھی سناٹا چھایا ہوا ہے۔ اگر گھاٹ پر کسی جگہ تک پہنچنے کی ممکنات نہ تھی۔ درختوں کی ڈالیوں پر شاذ و نادر کوئی پرندہ بول اٹھتا تھا۔ تب ایسا معلوم ہوا۔ کہ میرا دل لامحدود خوشی سے پھٹ جائے گا۔ جیسے اپنے دل کے اوپر ہی مجھے حسینہ کے آہستہ آہستہ پاؤں رکھنے کا احساس ہوا اس بنگلہ کے درختوں میں خود کو بسا کر جیسے میں اس حسینہ کی دل کش گفتگو مستانہ کو سننے لگا۔ وسیع با عقل قدرت کے دل کی تھرتھری جیسے میرے تمام جسم کی ہڈیوں میں دوڑنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے قدموں کے نیچے کی زمین اس حسینہ کے پاؤں کو گرفت میں نہ رکھ سکنے کے باعث اندر ہی اندر دھنسی جا رہی ہے۔ جھکی ہوئی ڈالیوں والے درخت اس حسینہ کی باتیں سنتے ہیں۔ لیکن سمجھ نہیں سکتے۔ اس لئے ان کے دل میں جو پر شور نالہ و فریاد بپا ہے۔ وہ بھی پتوں کی صدا اسے حرکت سے کچھ کچھ آشکارا ہو رہا ہے؛

میں بھی اپنے تمام جسم اور دل سے اس حسینہ کی خوش مزاجی اور گفتگو کرنے کا احساس کرتا ہوا اس حسینہ کے قدموں کو چھو نہ سکنے اور اس کی باتوں کو سمجھ نہ سکنے کے باعث دل ہی دل میں گڑھنے لگا؛

دوسرے روز مجھ سے رہا نہ گیا۔ اگلے دن اس حسینہ کے والد سے ملاقات کا ارادہ کر کے میں اُن کے گھر گیا۔ اس حسینہ کے والد شیام چرن بابو چشمہ لگائے۔ نیلی پنسل کے نشانوں سے ایک ماہر مصنف کی کتاب دیکھ رہے تھے۔ قریب ہی ایک پیالے میں چائے پڑی تھی۔ بنگلے کے قریب پہنچتے ہی انہوں نے میری طرف ایک بار پر تعجب اور معنے خیز نگاہ سے دیکھا۔ جب میں اُن کی طرف آگے کو بڑھا تب وہ کتاب رکھ کر نہایت اضطراب سے میرے استقبال کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے مختصر طور پر اپنا پتہ بتایا۔ اس پر انہوں نے بڑی عزت سے مجھے اپنے مقابل کی کرسی پر جگہ دی۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد انہوں نے استفسار کیا۔

"کیا آپ چائے پیتے ہیں؟"

میں چائے نہ پیتا تھا۔ تو بھی کہدیا۔

"ہاں"

شیام چرن بابو نے نلنی نلنی پکارا۔ دروازے کے پاس شیریں آواز میں سنائی دی ۔ "بابوجی"

میں نے گھوم کر دیکھا۔ میری شکنتلا خوف زدہ ہرنی کی طرح اندر کی طرف بھاگ جانے کو تیار ہے۔ شیام چرن بابو نے پھر اپنی بیٹی کو پکار کر میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے پڑوسی مسٹر نول کشور ہیں۔"

اس کے بعد مجھ سے کہا۔ "یہ میری بیٹی نلنی ہے"۔ نلنی نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کہی۔ میں نے بھی دھڑکتے ہوئے کلیجہ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کی نمستے کا جواب دیا۔ اب شیام چرن بابو نے نلنی سے کہا۔

"آپ کے لئے ایک پیالہ چائے لے آؤ۔"

میرے لئے نلنی کو چائے لانے کی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ ایسا خیال

کر کے میں جیسے بہت ہی بے چین ہو اُٹھا۔ لیکن میرے کچھ کہنے سے پیشتر ہی نلنی چائے لینے کے لئے اندر چلی گئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے عبادت کے جنگل میں مجسم طور پر رشی کنو نے اپنی بیٹی شکنتلا سے مہمان مہاراجہ کے لئے ایک پیالہ چائے لا دینے کو کہا ہو۔ مہمان کے لئے یقیناً وہ آبِ حیات کی طرح ہو گی۔ لیکن کیا یہ کام کرنے کیلئے وہی تھی، اور ایک ملازم قریب تھا۔

اب میں روزانہ شیام چرن بابو کے گھر جانے لگا۔ اس سے پیشتر میں چائے سے بے حد خوف زدہ رہتا تھا۔ لیکن اب صبح و شام روزانہ چائے کا چسکا سا پڑ گیا تھا۔

بی۔ اے کے امتحان کے لئے ایک جرمن فلاسفر کے تحریر کردہ تواریخ کا مطالعہ اس سال میں نے کیا تھا۔ چند روز میں اس حیلہ سازی کی آڑ میں اس حسینہ کے گھر آتا جاتا رہا۔ گویا میں شیام چرن بابو کے ساتھ اسی تواریخ کے مطالعہ میں جاتا ہوں۔ وہ ابھی تک ہماٹ وغیرہ چند انگریزی ادبی تواریخی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول تھے۔ اس بارے میں انہیں طالب علم خیال کرتا تھا۔ ساتھ ہی بڑے ساز و سامان کی آراستگی سے اپنا علم تو ظاہر کرنے میں کوتاہی نہ کرتا تھا۔ شیام چرن بابو مجھ اس طرح کے چھوٹے انسان اور کم گو تھے۔ کہ وہ میرے جیسے نوعمر نوجوان کی تمام باتوں کو بلا کسی قسم کی جرأت کے تسلیم کر لیا کرتے تھے۔ وہ اس بات سے خوف زدہ تھے۔ کہ ان کی جرح سے کہیں بُرا نہ مان جاؤں۔ میں جب اس طرح کرنے لگتا تب نلنی کسی نہ کسی بہانے اٹھ کر اندر چلی جاتی تھی۔ اس کے اس عمل سے جیسے مجھے افسوس ہوتا تھا۔ ویسے ہی مجھے اپنے دل میں ایک طرح کے فخر کا احساس بھی ہوتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ہمارے اس وضع کو نلنی سمجھ نہیں سکتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں جب میری تعریف کرے اس پیارے کا پتہ ہو گی۔ تب اسے بہت ہی کھینچے

[illegible]

نلنی کو جب میں دُور سے دیکھتا تھا۔ تو اُسے شکنتلا سنجوگتا وغیرہ تعجب خیز ناموں سے اور تعجب انگیز خیالات سے یاد کرتا تھا۔ لیکن اب اُسے اس کے گھر میں دیکھ کر مجھے معلوم ہوُا۔ کہ وہ سنجوگتا یا شکنتلا نہیں ایک بنگالی کی بیٹی ہے۔ اس کا نام نلنی ہے؛

اس وقت وہ میری نظر میں دُنیا کی عجیب روحوں کا سایہ نہیں بلکہ انسانی شکل میں نلنی ہے۔ وہ مجھ سے کبھی ہندوستانی اور بعض اوقات انگریزی میں بھی باتیں کرتی ہے۔ معمولی بات پر کبھی نہایت ہی سادگی سے ہنس دیتی ہے۔ وہ ہمارے گھر کی مستورات کی طرح دونوں ہاتھوں میں سونے کے کڑے پہنے ہے۔ گلے میں ایک سونے کی ست لڑی مالا ہے ساڑھی کا کنارہ کبھی سر پر رہتا ہے اور کبھی سرک کر کندھوں پر گر پڑتا ہے۔ وہ اب میری نظر میں محض تخیل کی خیالی تصویر ہی نہیں، بلکہ ایک انسان ہے۔ اور اس کا نام نلنی ہے۔ وہ اگرچہ میری تو نہیں۔ مگر پھر بھی اس نے میرے دل پر قبضہ ضرور کر لیا ہے؛

ایک دن میں آسمان کے متعلق بڑی دلیری سے شیاما چرن کے سامنے اپنی علمیت ظاہر کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نلنی وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی اور چند منٹ بعد سامنے کے برآمدے میں ایک ہاتھ میں سٹوپ اور دوسرے ہاتھ میں چائے کا سامان لا کر میٹھی آواز میں اس نے شیاما چرن بابو سے کہا

"آپ کیوں ان فضول باتوں میں نول کشور بابو کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آئیے نول کشور بابو! اس طرح بکواس کرنے کی بجائے تو یہ اچھا ہے۔ کہ آپ میری چائے بنانے میں مدد کریں۔"

شیاما چرن کا کوئی قصور نہ تھا۔ اور یہ بات نلنی سے بھی پوشیدہ نہ تھی۔ شیاما چرن نے مسکرا کر کہا۔

"اچھی بات ہے۔ نول بابو! اس مضمون پر دوسرے دن بات چیت ہوگی؟"

اسکے بعد وہ توجہ سے ایک کتاب پڑھنے لگے!

ایک دن تیسرے پہر اسی طرح کی کوئی بات لے کر میں شیاما چرن بابو کو اپنے علم کی روشنی دکھانا چاہتا تھا۔ اور انہیں حیرت میں ڈالنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ اسی وقت نلنی نے آکر کہا۔

"نول بابو! آپ سے ایک مدد چاہتی ہوں۔ دیوار پر بیل چڑھانی مطلوب ہے۔ مہربانی فرما کر یہ کیل دیوار میں گاڑ دیں!"

میں بہلے خود ہو کر مدد کرنے لگا۔ اور شیاما چرن خوشی سے کتاب پڑھنے لگے۔ اسی طرح جب بھی کبھی میں شیاما چرن کے سامنے کوئی بھاری بات شروع کرتا، کسی مشکل بات پر بحث کرنے لگتا۔ تب نلنی کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے ضرور ہی بند کر دیتی۔ میں اس بات پر دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا۔ میں خیال کرتا تھا کہ نلنی نے مجھے سمجھ لیا ہے۔ اس نے معلوم نہیں کس طرح یہ حل کیا ہے۔ کہ شاما چرن کے ساتھ عالمانہ بات چیت کرنا ہی میری زندگی کا مدعا نہیں!

ایک دن شیاما چرن کے آگے جسمانی رگوں کے متعلق بات چیت کرتے کرتے جب میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ تب اسی وقت کہیں سے نلنی آموجود ہوئی اور بولی۔

"نول بابو! چلیے آپ کو اپنا بینگن کا کھیت دکھا لاؤں!"

میں ایک دن اس بات کا لیکچر دے رہا تھا۔ کہ آسمان کو محدود سمجھنا ہمارا صرف خیال ہی ہے۔ ہمارا تصور اور طاقت خیل میں کبھی اس کا محدود ہونا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ اسی وقت نلنی نے آکر کہا۔

"باغ میں دو آم ایک ٹہنی سے لگے ہیں۔ میرا ہاتھ وہاں تک نہیں جاتا۔ اس لئے آپ ہی توڑ دیں!"

کیسا چھٹکارا تھا۔ انتہا ساگر کے بیچ ایک دم ساحل پر پہنچ جاتا تھا اور

میں آسمان اور دوسری چیزوں کے متعلق شک چاہے کیسا مضبوط یا کمزور ہو۔ نلنی کے بیگن کے کھیت یا آم کے پھلوں کے متعلق بالکل شک کی گنجائش نہ تھی۔ وہاں نظم و نثر میں تبدیلی نہ ہونے پر بھی زندگی کے اندر سمندر میں کھڑے ہوئے کنول کی طرح دل کش ہے۔ زمین پہ پاؤں رکھنے سے کیسا آرام ملتا ہے۔ اس بات کو کوئی جان سکتا ہے جو بہت دیر تک پانی میں تیرتا رہا ہو۔ میں نے تعارف کے پہلے جس خیالی محبت کی دنیا قائم کی تھی۔ وہ اگر سچ ہوتا تو کہا نہیں جا سکتا۔ کہ میں اس میں کافی دیر تک کس طرح تیر سکتا۔ وہاں تو آسمان بھی لامحدود تھا۔ اور سمندر بھی بے کنار، نلنی اس یہاں ساگر میں ڈوبے ہوئے مجھے بال پکڑ کر اپنے بیگن کے کھیت میں اور آم کے پھل توڑنے کے لئے آم کے درخت کے نیچے گھسیٹ لائی۔ تب مجھے ایسا احساس ہوا۔ کہ اب میں زمین پر کھڑا ہوں، میں نے دیکھا۔ کہ برآمدے میں بیٹھ کر چائے بناتے ہوئے مذاق کرتے ہیں، دیوار میں کیلیں گاڑنے میں، بیگن کے کھیت دیکھنے میں اور آم توڑنے میں ایک بے حد مسرت ہوتی ہے۔ جس کا اندازہ ایک انسانی دماغ لگا ہی نہیں سکتا، اور ساتھ ہی مزہ یہ کہ اس خوشی کے لئے کوئی خاص کوشش بھی نہیں کرنی پڑتی۔ جو باتیں ہوتی ہیں، جیسے مسکراہٹ آتی ہے۔ آسمان پر سورج، چاند، یہاں تک کہ درخت بھی مطابق ہیں:

یہاں پہ میں اپنے ناظرین کو ایک اور بات کہہ دینا مناسب خیال کرتا ہوں۔ ایک بنگالی سکول کی دوشیزہ سے شادی کرنے کا بانکے بہاری کا ارادہ سن کر میں بہت حیران ہوا تھا۔ اسی خیال کو لے کر میں نے ایک تیز نشتر کی طرح مزاحیہ مضمون بھی لکھا تھا۔ مگر جب میں نے نلنی کو دیکھا تب سے میرا وہ ارادہ اور خیال بدل گیا۔ بنگالی سکول کی لڑکی سے شادی

اب بانکے بہاری لال کی شادی میرے خیال میں ناقابل برداشت نہیں اور میں برہمو سماج کے خلاف نہیں ہوں ۔شیاما چرن بابو کے ساتھ میں کئی بار جاکر اُن کی اوپاسنا دیکھ آیا ہوں ۔ اور بنگالی سکول کے طلبہ سے پریم اور کھانے وغیرہ کا انتظام اکٹھا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔اس زمین پر ایک بہت لمبا چوڑا مضمون بھی میں نے سالانہ جلسہ پر پڑھنے کے لئے کا نمبر بھیجا ہے ۔ اور نلنی کے ساتھ شادی کرنے کا خیال اور زیادہ مضبوط ہو گیا ہے ۔اگر والدین اس شادی کے خلاف ہونگے تو ہوتے رہیں ۔ میں پرواہ نہ کروں گا ۔ باقی رہ گیا نلنی کے باپ کا خیال ۔سو میرے خیال میں وہ اسکے خلاف ہی نہیں ۔اور نلنی کے تعلقات سے تو یہ خواب میں بھی خیال نہیں ہو سکتا ۔کہ مجھ سے محبت نہیں کرتی ۔مجھے یقین ہے کہ میرے پاس خوبصورتی ،قابلیت ،علم اور دولت کا جادو ہے ۔ اور وہ جادو نلنی کے دل پر مکمل طور پر قبضہ کر چکا ہے ۔ نلنی میری ہے ۔ اور صرف میری ہے ۔اب اس میں شک کی گنجائش نہیں رہی ۔اور نلنی مجھے اُلفت کی نگاہ سے کیوں نہ دیکھے ۔اُسے ایسا کرنا ہی پڑتا ہے کیونکہ مجھ میں کسی بات کی کمی نہیں ـــــ نلنی جب میرے ہاتھوں میں چائے کی پیالی دیتی تھی ۔میرے خیال میں اس وقت اس پیالی کے ساتھ اس کی محبت بھی ملی ہوئی ہوتی تھی ۔اور جب میں چائے پیتا تھا ۔تب میرا دل خوشی کے اتھاہ ساگر میں غوطہ زن ہو جاتا تھا ۔ایسا معلوم ہوتا تھا ۔کہ میرے جیسا خوش نصیب اس عالم میں اور دوسرا نہیں ہو سکتا نلنی اگر کبھی معمولی طور پر کہتی تھی :

"نول بابو ! کل صبح ہی تشریف لائیے گا ـ" تو میں خوشی میں پھولا نہ سماتا تھا !

اب دن رات ایک یقینی خواہش کے ساتھ میرا دل کچھ محسوس کیا

کرتا تھا۔ میری تمام سوچ بچار اور تخیل لمحہ بہ لمحہ ایک نئی چیز کا اختراع کر کے بیل کی طرح بڑھنے لگا۔ اور چار طرف سے نلنی کو گھیرنے کی خواہش کرتے ہوئے اس کو اپنے آپ میں جذب کر لینے کی خواہش پیدا ہونے لگی ایک دماغ تھا۔ اور ہزاروں خیالات کا ہجوم۔ میں مکان پر اکیلا ہوتا تھا تب فانی دنیا کے متعلق نظم لکھنے کی بجائے یہی سوچا کرتا تھا کہ شادی کے بعد نلنی کو یہ پڑھاؤں گا۔ یہ لکھاؤں گا۔ یہ سناؤں گا۔ میں نے دل میں یہ تہیہ کیا تھا۔ کہ جرمن عالم کا لکھا ہوا وہ تاریخی مضمون بھی نلنی کو پڑھاؤں گا۔ خود استاد بن کر نلنی کو انگریزی علم و ادب کی سیر بھی کراؤں گا۔ یہ تھے میرے پکے ارادے۔ ایک دن میں نے دل ہی دل میں ہنس کر کہا۔

نلنی تمہارے آم کے درخت اور بیگن کا کھیت میرے لئے بے شک ایک نئی چیز ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ کہ وہاں آم اور بیگن کے علاوہ آبِ حیات کی ایک پوشیدہ نہر بھی جاری ہے۔ مگر جب وقت آئیگا۔ میں بھی تمہیں ایک ایسی ہی سرزمین میں لے آؤں گا۔ وہاں آم اور بیگن تو نہیں ہوتے۔ مگر ایک ایسی نادر چیز ملتی ہے جس کے آگے بیگن اور آم کی کچھ بھی قدر نہیں۔ وہ ایک ادبی کارنامہ ہے!

سورج غروب ہو جانے کے بعد جیسے آسمان پر ستارے اپنی نورانی چمک دکھاتے ہیں۔ اس طرح سے چند دنوں سے نلنی بھی اندرونی خوشی جو ان کے مکمل آنند اور خوب صورتی سے مسرت کے دریا میں غوطہ زن رہنے لگی۔ جیسے وہ اپنے گھر کے نظامی آسمان پر خورشید ہو کر ہر جانب خوشی کی منور لکیر پھیلانے لگی۔ اس روشنی کی پاک لکیر اسکے پتا کے سفید بالوں پر کامیابی کے آرام کی طرح بڑھنے لگی۔ اس روشنی نے میرے امنڈتے ہوئے دلی سمندر کی ہر ایک لہر پر جیسے سنہری حروف سے نلنی کا نام لکھ دیا!

ادھر پھر پتا جی کے خط آنے لگے۔ شادی کے لئے پتا جی کا پریم بھری خط و کتابت آہستہ آہستہ مشکل حکم کی شکل اختیار کر کے حملہ کرنے لگی ادھر موتی لال کو بھی اپنے سے دُور رکھنا ناممکن معلوم ہونے لگا۔ نا معلوم کس دن بدمست جنگلی ہاتھی کی طرح اچانک آ کر میرے اس کنول پھول کے پاس اپنے موٹے موٹے چاروں پاؤں رکھ کر تمام برباد کر دے ——

یہ خیال ہر لمحہ مضبوط ہو رہا تھا۔ مجھے اب فکر تھا۔ کہ کس طرح شیاما چرن بابو اور نلنی کے سامنے اپنے ارادے کو ظاہر کروں۔ کیونکہ شادی سے طے ہو جانا ہی بہتر معلوم ہو رہا تھا۔ اپنے پتا جی سے تو اس معاملہ میں مشورہ لینے کی ہمت ہی نہ تھی۔ کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ وہ ماضی کے دلدادہ ہیں۔ اس لئے اس غیر مطابق کے جوڑ کو وہ کبھی بھی تسلیم نہ کریں گے۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا۔ کہ شادی کے بعد یکا یک نلنی کو لے جا کر اُن کے سامنے معافی مانگ لوں گا۔ ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا تھا۔ کہ اگر وہ معاف نہ کریں گے۔ تو نلنی کو لے کر الگ ہو جاؤں گا۔ نلنی کے واسطے میں ذات کو، پتا کی دولت کو، یہاں تک کہ سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہو جاؤں گا۔ مگر نلنی کو نہیں!

ایک دن دوپہر کو شیاما چرن بابو کے بنگلہ میں جا کر دیکھا۔ کہ وہ گرمی کی وجہ سے کمرے کے اندر آرام کرسی پر سو رہے ہیں۔ دروازے پر چلمن پڑی ہے۔ اور ملازم اپنی پوری قوت سے پنکھے کی رسی کھینچ رہا ہے۔ دوسری طرف دیکھا سامنے ہی گنگا ساحل کی طرف سے آدھے میں گھاٹ کی اوپر والی سیڑھی پر نلنی بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں گنگا کی طرف اور پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے خاموشی نلنی کے پیچھے جا کر دیکھا۔ اسکے ہاتھ میں ایک بالکل نئی انگریزی نظم کی کتاب تھی جو صفحہ وہ پڑھ رہی تھی، اسمیں شیلے کی ایک نظم تھی۔ اور اس نظم کے

چاروں طرف بہت ہی صفائی سے لال روشنائی سے لکیریں کھینچی تھیں اس نظم کو پڑھ کر نلنی نے ایک سرد آہ بھری اور مدہوش سے شاید نشہ اُلفت کی مدہوشی سے بھری ہوئی آنکھیں اُٹھا کر آسمان کیطرف دیکھا۔ معلوم ہوا جیسے نلنی بار بار اسی نظم کو پڑھ رہی ہے۔

شیلے نے وہ نظم کسی کو مخاطب کر کے لکھی تھی۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں اس میں بھی شک نہیں کہ نول کشور نام کے ایک بنگالی نوجوان کو مخاطب کر کے نہیں لکھی گئی۔ مگر میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آج نول کشور کو ہی یاد کر کے نلنی بار بار اس گیت کو پڑھ رہی تھی۔ نول کشور کی مہربانی سے ہی آج شیلے کی قسمت چمک پڑی ہے۔ کہ اسکی نظم نلنی کو اتنی دلکش معلوم ہوتی۔ ضرور ہی نلنی نے اس گیت کے ہر طرف سرخی سے لکیریں نہیں بنائی۔ بلکہ میں نے اپنے دل کے خون سے اور محبت کی چوکھٹ میں جڑ دیا۔ اس قدرتی محبت کے جادو سے آج وہ گیت اسی کا ہے۔ اور اسکے ساتھ میرا بھی ...... اپنے اُچھلتے ہوئے محبت بھرے دل کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر میں نے دریافت کیا۔ "کیا پڑھ رہی ہو؟"

جس کے بادبان میں ہوا بھری ہو۔ اور وہ کشتی چلتے چلتے جیسے یک دم پانی میں چھپی ہوئی کسی چٹان سے رک جائے۔ میری آواز کے ساتھ ہی نلنی یک دم چونک اُٹھی۔ چشم زدن میں کتاب بند کر کے اپنے آنچل میں چھپا لیا۔ میں نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ "کیا میں اس کتاب کو ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟"

نلنی کے دل کو چوٹ سی لگی۔ اس نے جواب دیا۔ "نہیں، نہیں، آپ سے نہ دیکھئے؟"

میں نلنی سے کچھ فاصلہ پر نیچے سے اوپر کی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی میں نے انگریزی نظم کی ادبیات پر بات شروع کر دی۔ بات اسطرح کی جسطرح نلنی کو بھی انگریزی ادب کے متعلق زیادہ واقفیت ہو۔ اور میرے دلی خیالات بھی انگریزی شعرا کے ذریعہ اسے اچھی طرح معلوم ہو جائیں۔ اسوقت تیز دھوپ کے گہرے سناٹے میں ہر چیز بہت ہی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی!

نلنی بے چین ہو اٹھی۔ اس نے کہا۔ "بابو جی اکیلے بیٹھے ہیں۔ کیا آپ اپنے سابقہ مضمون کو آج ختم نہ کریں گے؟"

میں نے دل میں کہا۔ مضمون تو ہوتے ہی رہینگے اور شاید تا زیست ختم ہی نہ ہوں مگر عمر تھوڑی سی ہے۔ اور اسمیں بھی ایسا دلکش اور پر لطف وقت قسمت سے ہی ملا کرتا ہے۔ نلنی کی بات کا کوئی جواب نہ دیکر میں نے کہا۔ میں نے کچھ گیت لکھے ہیں۔ کہو تو سناؤں؟"

"کل سنوں گی"۔ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر بنگلے کی طرف دیکھکر بولی۔ "بابو جی! نول کشور بابو آئے ہیں"۔

شیاما چرن حسب معمول آنکھیں ملتے ہوئے آ کھڑے ہوئے۔ میرے دل کو ایسی چوٹ لگی۔ جیسے کسی نے زہر بھری چھری گھونپ دی ہو۔ شیاما چرن بابو کے پاس جا کر میں نے مضمون کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ اور نلنی معلوم ہوتا تھا کتاب پڑھنے [illegible] اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ اور وہ نظم پڑھنے لگی۔

دوسرے دن صبح کی ڈاک سے اسٹیٹ مین اخبار ملا۔ اسمیں کلکتہ یونیورسٹی سے امتحان دینے والوں کے نتیجے۔ اسمیں بی۔ اے کا نتیجہ چھپا ہوا تھا۔ پہلے ہی فسٹ ڈویژن میں نلنی بالا کا نام دکھائی دیا۔ میرا نام پہلے دوسرے یا تیسرے کسی حصہ میں نہ تھا۔

امتحان میں فیل ہونے کے افسوس کیساتھ ہی یہ شک تیر کیطرح میرے دل کو چھلنی کرنے لگا۔ "نلنی بالا کیا میری ہی نلنی ہے؟"

اس نے اگرچہ کبھی بھی مجھ سے نہیں کہا کہ میں نے کالج میں تعلیم حاصل کی ہے یا امتحان دیا۔ تب بھی میرا شک آہستہ آہستہ مضبوط ہونے لگا۔ بوڑھے باپ اور لڑکی نے کبھی اپنے متعلق مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ اور میں بھی اپنا کہانی سنانے اور اپنی ہوشیاری دکھانے میں ایسا بے چین رہتا تھا۔ کہ کبھی اُن سے اُن کا حال اچھی طرح معلوم کرنیکی میں نے خواہش ہی نہیں کی۔ بس جرمن عالم کے دوشیزگی پر لکھے ہوئے اور میرے پڑھے ہوئے مضامین مجھے

یاد آنے لگے۔ پھر یہ بھی یاد آیا کہ ایک دن میں نے نلنی سے کہا تھا ۔ "آپکو چند دن اگر ایسی ہی تواریخ پڑھنے کا موقعہ ملے۔ تو میں انگریزی گیتوں کے متعلق آپ کے دل میں خاص خواہش پیدا کر سکتا ہوں"۔

نلنی بالا نے اس مضمون پر انعام لیا ہے۔ اور ادب میں اول نمبر پر پاس ہوئی ہے۔ اگر یہی نلنی ہو؛

آخر میں نے اپنے غرور کو ایک چپت لگائی۔ اور دل میں کہا۔

ہو تو ہوتے دو۔۔۔ میرے مضامین اور گیت میری علمیت کا کافی ثبوت ہیں۔ اب اپنے گیتوں کی کاپی ہاتھ میں لئے تیز قدم چلتا سر کو پہلے کی نسبت غرور سے اور اونچا کر کے شیاما چرن بابو کے بنگلہ کیطرف روانہ ہوا۔ اسوقت اُسکی بیٹھک میں کوئی نہیں تھا۔ میں وہاں بیٹھا ایک ایک کتاب اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ دیکھا میرے اس جرمن پروفیسر کی کتاب بے عزتی کے ساتھ ایک طرف پڑی ہے۔ میں نے کتاب کھول کر دیکھا۔ شیاما چرن بابو کے ہاتھ سے لکھے ہوئے بے حساب مارجن اس میں ہیں۔ بوڑھے نے خود اپنی لڑکی کو پڑھایا ہے۔ مجھے اب شک نہیں رہا۔ یہ وہ نلنی ہے۔

اتنے میں شیاما چرن بابو کمرے میں آ گئے۔ آج اُن کے چہرے کا رنگ معمول سے چمک رہا تھا۔ اور آنکھوں سے دلی مسرت ظاہر ہو رہی تھی جیسے کسی اچھی خبر کو وہ ابھی ابھی سُن کر آئے ہیں۔ میں نے بیکا یک کچھ افسوس کے انداز سے بناوٹی ہنسی ہنس کر کہا۔

"بابو جی! میں امتحان میں فیل ہو گیا ہوں"۔

میرے کہنے کے ڈھنگ سے یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ جو بڑے بڑے آدمی کالج کے امتحان میں فیل ہو کر زندگی کے امتحان میں پاس ہوتے ہیں انہیں کی صف میں میرا نام بھی آئے گا۔ امتحان، کاروبار، ملازمت دوکانداری وغیرہ میں گھس جانا دوسرے درجے کے انسانوں کا کام

ہے۔ ان سب پر عبور حاصل کرنے والے یا تو درجہ اول کے لوگ ہیں۔ یا سوم کے۔ شیاما چرن بابو کا چہرہ آلفت کے زیر اثر چمک اٹھا تھا۔ وہ اپنی لڑکی کے پاس ہونے کی خبر نہ سنا سکے۔ مگر میری اس عجیب خوشی کو دیکھ کر حیران ضرور ہوئے۔ اُن کے بوڑھے تجربہ کو میری اس خوشی کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔

اسی وقت ہمارے کالج کے نئے پروفیسر مسٹر بانکے بہاری لال کے ساتھ چہکتا ہوا! عجیب چہرہ لئے ململی بارش کے پانی سے دُھلی ہوئی بیل کی طرح لہلہاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اب اور کچھ سمجھنے کیلئے باقی نہ رہا۔ تمام راز ظاہر ہو گیا۔

شب کو مکان پر آکر میں نے اپنے گیتوں کی کاپی جلا دی۔ دوسرے دن سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ اور وہاں والدین کی خواہش کے مطابق شادی کر لی!

گنگا کے ساحل پر مجھے بہت بڑی نظم لکھنے کا خیال تھا۔ وہ تو نہیں لکھی جا سکی۔ مگر اس نظم کا مفہوم میں اپنی زندگی میں سمجھ گیا ؎

اغیار میرے رازِ محبت کو پا گئے
رونا یہ ہے کہ آپ پہ افشا نہ ہو سکا

قرضہ

مندر کے مقابل، روز کی طرح اندھی آ کھڑی ہوئی۔ آنے جانے والوں کی خاص بھیڑ تھی جسب معمول لوگ آتے تھے۔ اندر درشن کرکے چلے جاتے تھے۔ اندھی پاؤں کی چاپ سے بخوبی اندازہ لگا رہی تھی کہ یہ عورت ہے، یہ مرد ہے، یہ بچہ ہے۔ اسے یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ مندر میں جانے والے تمام عبادت گزار رحم دل ہوتے نہیں۔ وہ ہاتھ پھیلائے نہایت مسکین صورت بنائے روندھے ہوئے گلے سے ہر آنے جانے والے پر سوال کر رہی تھی:

"مائی کیا اندھی پر دیا نہ کروگی؟ بابو اندھی کو کچھ دیتے جاؤ!"

نرم دل لوگ کچھ نہ کچھ اس کے ہاتھ پہ رکھ کر چلے جاتے۔ اندھی اُن کو ہزار ہا دعائیں دیتی اور صبح سے بارہ بجے تک اور چار سے سات بجے تک وہیں کھڑی رہتی۔ اور شام کو لاٹھی کا سہارا لئے جھونپڑی کی طرف روانہ ہو جاتی۔ اس کی جھونپڑی شہر کے دوسرے سرے پر تھی تمام راستہ وہ اپنی صدا بلند رکھتی۔ مگر بجائے کچھ اور ملنے کے الٹی سیدھی گالیاں سننے کو ملتیں۔ شاید تمام باتیں اس کے کان سننے کے عادی

عادی ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ مایوس نہ ہوتی۔ سوال لب پہ اور ہاتھ دراز ہی رہتا۔ نتیجہ کے طور پر دو چار پیسے اور مل ہی جاتے۔

مکان کے قریب سڑک پہ ہی ایک دس سالہ لڑکا اُس کی ٹانگیں پکڑ لیتا۔ اندھی اُسے گود میں اُٹھا لیتی۔ اور اس کی پیشانی پہ بوسہ دیتی۔ بچہ کہاں سے آیا؟ کون ہے؟ کس کا ہے؟ کیا یہ کوئی نہیں جانتا؟ کسی کو بھی یہ راز معلوم نہیں۔ پانچ برس پیشتر یہ بالکل اکیلی تھی۔ پھر چند دن بعد ہی لوگوں نے دیکھا کہ ایک شام کو وہ بچہ کو گود میں لئے ہوئے ہے۔ بچہ رو رہا ہے۔ اور اندھی پیار، دلاسا دے کر اُسے چُپ کرا رہی ہے۔ یہ عجیب واقعہ کوئی معمولی نہیں۔ باوجود اس بات کے کسی نے بھی اُس سے دریافت نہ کیا:

"بچہ کون ہے؟"

اُسی دن سے یہ لڑکا اُس کے پاس ہے۔ دونوں خوش ہیں۔ اندھی نے اُسے بچوں کی طرح پالا ہے۔ اپنی جھونپڑی میں اُس نے ایک مٹی کا برتن زمین دوز کر رکھا ہے۔ جو مانگ کر لاتی ہے۔ اس میں ڈال دیتی ہے۔ کھانے کے لئے اناج، روٹی اور پہننے کے لئے کپڑا با افراط اُسے مل جاتا ہے۔

بنارس ہندوؤں کا بہت بڑا تیرتھ ہے۔ دُور دُور سے یاتری اشنان کے لئے وہاں آئے دن جمع رہتے ہیں۔ چوک بازار میں سیٹھ کندن لعل کی دوکان خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی شہرت دُور و نزدیک تک پھیلی ہوئی ہے۔ لاکھوں کا کاروبار ہے۔ سینکڑوں مقروض ہر وقت درِ دولت پر حاضر رہتے ہیں۔ کئی اشخاص جن کے پاس تھوڑا بہت اثاثہ ہوتا وہاں جمع کرا جاتے۔ تاکہ محفوظ رہ سکے۔ اندھی بھکارن اس کیفیت سے اچھی طرح واقف تھی۔ اور موقعہ کی تاک میں تھی

کہ کب اپنی جائیداد کندن لعل کے پاس جمع کرا دے۔ اسی کشمکش میں کئی سال گذر گئے۔ آخر وہ مٹی کا برتن لبا لب بھر گیا۔ اُسے خیال ہوا۔ کہ مُبادا کسی کو یہ راز معلوم ہو جاوے۔ تو میں لُٹ جاؤں گی۔ اُسی شام کو اُس نے برتن خالی کر دیا۔ اور ایک پھٹی ہوئی قمیض میں سب کچھ باندھ کر سیٹھ صاحب کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی؛

کندن لعل نے ایک منیم کو اشارہ کیا، اُس نے پُوچھا۔

"کیوں مائی کیا چاہتی ہو؟"

"مہاراج! یہ تھوڑا بہت جو کچھ ہے۔ جمع کر لیں۔ مجھے دکھائی تو دیتا نہیں۔ کہاں سنبھالوں؟"

یہ کہہ کر اندھی نے وہ گٹھڑی زمین پر رکھ دی۔

"یہ کیا ہے؟"

"آپ ایسے مہربانوں سے مانگ کر چند پیسے جمع کئے ہیں۔ شاید بچے کے کام آئیں۔ اپنے پاس رکھتے ڈرتی ہوں۔ تاکہ کوئی چرا کر نہ لے جائے؟"

سیٹھ کے اشارہ سے منیم نے تمام رقم ایک کھاتہ میں جمع کر لی۔ پھر دریافت کیا۔

"تمہارا نام؟"

"نینتا"

چند منٹ کے بعد اندھی اپنی جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھی بھولی بچے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی؛

تین سال کا لمبا عرصہ نہایت اطمینان سے بسر ہوا۔ یکایک ایک دن بد پرہیزی کی وجہ سے لڑکے کو بخار ہو گیا۔ اندھی مانگنے نہیں گئی۔ دوائی اور دُعا بھی۔ ٹونے بھی کئے اور جادو بھی آزمایا۔ اس نے

اپنی کوشش سے دن رات ایک کر دیا۔ مگر سب بے فائدہ۔ بیماری میں افاقہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ حالت ہر لمحہ بد سے بدتر ہو گئی۔

اندھی کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ حوصلہ پست ہو گیا۔ آخر سر تھامے دروازے پر بیٹھی تھی۔ کہ ایک پڑوسن نے آکر دریافت کیا۔

"کیا حال ہے لڑکے کا؟"

"وہی — کچھ فائدہ نہیں ہوا"

"ڈاکٹر سے تم کا علاج کیوں نہیں کرتی؟"

اندھی کے تاریک دل میں روشنی کی ایک شعاع نمودار ہوئی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"میں بھول گئی بہن! ابھی جاتی ہوں"

فیس کی ضرورت ہوگی۔ اس خیال سے وہ سیٹھ کندن لعل کی دکان پر پہنچی اور عرض کی:

"بالو جی! دس روپے درکار ہیں۔ میرا بچہ بیمار ہے۔ ڈاکٹر کو دکھاؤں گی"

"کیسے روپے؟ ہمارے پاس کوئی روپے نہیں"

جس تیزی سے کچھ حوصلہ ہوا۔ اسی تیزی سے جاتا رہا۔ اندھی لاٹھی رکھ کر وہیں بیٹھ گئی۔ اور پھر عرض کی —

"تین برس ہوئے۔ آپ کے پاس میں جمع کروا گئی تھی۔ اُن میں سے مانگ رہی ہوں"

سیٹھ صاحب نے انداز تغافل سے منیم کی طرف دیکھا اور کہا۔

"دیکھیو اس کی کوئی رقم جمع ہے"

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"ہیمو"

اب اندھی کی جان میں جان آئی۔ پیشتر اسے خیال گذرا تھا۔ کہ سیٹھ بے ایمان ہے۔ مگر نہیں ایسے دھرماتما شخص سے یہ توقع نہیں صبح اشنان وغیرہ کرکے چار گھنٹے پوجا پاٹھ کرتے ہیں۔ یہ کسی کی رقم کیوں ہضم کرنے لگے۔ ایسے ہی بھول گئے ہوں گے!

شاید ملازم مالک کا کوئی خاص اشارہ سمجھ چکا تھا۔ کھاتے کے ورق الٹ پلٹ کر کہنے لگا:

"نہیں! یہ نام تو درج نہیں!"

مگر اندھی وہیں بیٹھی رہی۔ رو کر، ہاتھ جوڑ کر، منت کرکے بولی "کچھ دے دیجئے، بھگوان کے لئے دے دیجئے۔ میرا لڑکا جی اٹھے گا۔ تمام عمر آپ کے احسان کو یاد رکھوں گی!"

لوگ کہتے ہیں پتھر پگھل جاتے ہیں۔ مگر پتھر دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ بجنسہ یہی حالت ہوئی۔ منیم نے بارعب کڑکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"جاؤ چلی جاؤ، یہاں سے!"

اندھی نے لاٹھی پکڑی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر دکان کی طرف منہ کرکے بولی:

"اچھا بھگوان تمہارا بھلا کریں!"

یہ دعا نہیں۔ بلکہ ایک جلے ہوئے دل سے نکلی ہوئی بد دعا تھی لڑکے کی حالت اور خراب ہو گئی۔ دوا کے لئے پیسے نہیں تھے۔ کیا کیا جاتا۔ اندھی ہر وقت بھگوان لعل کو بد دعا دیتی، گالیاں نکالتی سینہ [illegible] ٹھنڈا نہیں ہو سکتا تھا۔ بخار بہت تیز تھا۔ لڑکے کو بالکل بے ہوشی تھی۔ اندھی نے اسے گود میں اٹھایا۔ اور کسی طرح گرتی پڑتی [illegible] لعل کے مکان کے دروازے پر جا بیٹھی۔ کسی نہ کسی طرح

یہ خبر سیٹھ صاحب کو بھی ہو گئی۔ اُنہوں نے حکم دیا۔ کہ اسے فوراً کوچہ سے باہر نکال دیا جائے ؛

ملازموں نے باہر آ کر اندھی کو بہت کہا۔ مارنے تک کی دھمکی دی مگر وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلی۔ آخر مجبوراً سیٹھ صاحب کو خود باہر آنا پڑا ؛

"ہیں ! یہ کیا ؟"

لڑکے کی شکل بجنسہٖ شام جیسی تھی۔ جو آٹھ سال ہوئے گم ہو گیا تھا۔ اور کافی تلاش کے باوجود بھی اُس کا کچھ سراغ نہ لگ سکا خیال پیدا ہوا کہ شام کی پیٹھ پر ایک سیاہ دھبہ تھا۔ دیکھنے پر دھبہ بھی موجود پایا۔ اب کندن لعل سے نہ رہا گیا۔ اُسی وقت اندھی کی گود سے لڑکا اُٹھا لیا۔ اور اندر چلے گئے ؛

اندھی نے چلا کر کہا۔

"کیا اب بچے کو بھی لے جاؤ گے ؟ روپے تو لے ہی چکے ہو ؛"

"لڑکا تمہارا نہیں میرا ہے۔ اسے ہر جائز ناجائز کوشش کر کے بچاؤں گا ؛"

"تمہارا لڑکا ہے۔ اس لئے کوشش کر کے بچاؤ گے ؟ بے شرم اگر میرا ہوتا۔ تو مر جانے دیتے۔ پرواہ نہ تھی۔ یہ ہے تمہارا سرمایہ داروں کا انصاف ! آٹھ سال تک اسے اپنا خون پلا کر پالا ہے۔ اب میں اسے ہرگز نہیں دے سکتی ؛"

چند منٹ سیٹھ صاحب دروازہ میں کھڑے رہے۔ آخر دل میں فوراً فیصلہ کر کے اندر چلے گئے۔ اندھی روتی روتی جھونپڑی میں لوٹ آئی ؛

اس کے پانچ منٹ بعد شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹر مریض کے گرد جمع تھے۔ اور دوا تجویز ہو رہی تھی۔ دوسرے ہی دن لڑکے کو

کچھ افاقہ ہوا۔ اور اُس نے آنکھ کھولی۔ اپنے گرد اجنبی صورتیں دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"ماں"

اور اُس کے بعد پھر غشی طاری ہو گئی۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی بچے نے دوبارہ آنکھیں نہ کھولیں۔ آخر اس اندھی کی تلاش شروع ہوئی۔ کافی تلاش کے بعد اُس کا مکان ملا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور وہ ایک شکستہ چٹائی پر پڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بخار سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ پاس کھڑے ہونے سے گرمی معلوم ہوتی تھی۔ آخر حکیم نے اُسے جھنجوڑ کر ہوشیار کیا۔ بیدار ہونے پر کہا۔

"تمہارا بچہ جاں بلب ہے۔ اور تمہیں یاد کر رہا ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے۔ شاید تمہیں دیکھ کر بچ جائے۔"

"میں نہ جاؤں گی۔ اب ہم دونوں کا ملاپ دوسری دنیا میں ہی ہو سکتا ہے۔ اس میں نہیں۔"

لاکھ کوشش کے باوجود بھی اندھی نہ گئی۔ ملازموں نے تمام ماجرا سیٹھ صاحب کے گوش گذار کر دیا۔ وہ خود موٹر میں بیٹھ کر آئے اور آتے ہی سر اندھی کے قدموں پر رکھ دیا۔ اور کہا۔

"تم بھی اس کی ماں ہو۔ ما[illegible] لاج تمہارے ہاتھ ہے۔ چلو!"

"سیٹھ صاحب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ مجھ ابھاگی کو اور بھی پاپوں کا بھاگی بنا رہے ہیں۔ میں چلتی ہوں۔"

وہ لاٹھی کے سہارے آکر موٹر میں بیٹھ گئی۔ گاڑی ہوا سے باتیں کرتی تھی۔ موٹر میں دو دل ایک ہی کیفیت میں زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ معاً چشم زدن میں مکان کے سامنے جا کر رکی۔ اندھی نے لڑکے

کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"بچے"

شام نے اسی وقت آنکھیں کھولیں۔ ماں کی آواز کو پہچان کر اس نے کہا۔

"ماں! آ گئی ہو؟"

"میں گئی کہاں تھی بیٹا؟ یہیں تو تھی"

یہ کہہ کر وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اور اُسے گود میں لے لیا۔ دوسرے ہی دن مرض میں افاقہ ہونے لگا۔ ایک ماہ کے قلیل عرصہ میں شام بالکل تندرست تھا۔ جو کام حکیم، وید اور ڈاکٹروں سے نہ ہو سکا۔ وہ اندھی کی محبت آمیز خدمت نے کر دیا۔

اب اندھی نے اجازت طلب کی۔ سیٹھ صاحب نے لاکھ کہا۔ کہ اب یہیں رہو۔ مگر وہ ایک نہ مانی۔ مجبوراً اُسے رخصت کرنا ہی پڑا۔

بوقت روانگی اُسے ایک تھیلی پیش کی گئی۔ اندھی نے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"میرا گناہ۔ تمہارے روپے"

"یہ روپے میں نے شام کے لئے جمع کئے تھے۔ اُسے ہی دے دیجئے"

دوسرے دن اُسے شہر میں کسی نے نہیں دیکھا۔

جاسوس

میں جاسوس ہوں۔ میرا نام ہے "شونانتھ"

میری زندگی کے صرف دو پہلو تھے۔ ایک میری بیوی اور دوسرے فن سراغرسانی، پہلے ہم دونوں بھائی اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن اپنی بیوی کی عزت میں کمی دیکھکر میں بڑے بھائی سے اُلجھ پڑا۔ اور ہم علیحدہ ہو گئے۔ بڑے بھائی بازورگار تھے۔ اور اُنکی آمدنی سے ہی گزارہ ہوتا تھا۔ اس لئے یکایک اُن سے علیحدہ ہو جانا واقعی بڑے حوصلہ اور دلیری کا کام تھا۔ مگر میں باہمت دلیر اور استقلال کا پورا ہوں۔ اور جس ارادے کو ایک بار پکا کر لیتا ہوں۔ اُس پر مضبوط چٹان کی طرح قائم رہتا ہوں۔ پھر کوئی دنیاوی طاقت مجھے میرے اس مصمم ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی!

اس دفعہ بھی میں اس بات کو بخوبی جانتا تھا۔ کہ جیسے میں نے اپنی بیوی کو قابو میں کر لیا ہے۔ اس طرح سحرکار سرکش دولت کو بھی بہت جلد زیر کر لونگا۔ شونانتھ اس رنگین دنیا میں کسی بھی بشر سے پیچھے نہیں رہ سکتا!

میں محکمہ پولیس میں پہلے معمولی کانسٹیبل بھرتی ہوا۔ اور ابتدا میں سی۔آئی۔ڈی میں داخل ہوتے اور اونچے درجے تک پہنچتے بہت دیر نہ لگی۔

چمکیلے ہوئے ... چاروں طرف جیسے کمال نکلتا ہے۔ ویسے ہی میری ...

کی بے انداز محبت بنے. اب رشک اور شک ٹپکنے لگا. جس کی وجہ سے میرے کام میں کچھ رکاوٹ پیدا ہونے لگی. کیونکہ سراغرسانی ایسے کام میں داخل ہو کر جگہ بہ جگہ اور وقت بوقت کا خیال نہیں کیا جا سکتا. بجائے اچھی جگہ کے بُری جگہ اور وقت کی بجائے بے وقت کی تعریف زیادہ کرنی پڑتی ہے. اور اسی وجہ سے میری بیوی کا قدرتی شک اور بھی بڑھ جاتا تھا. اور وہ مجھے دھمکانے کے لئے کہا کرتی تھی:

"آپ جب چاہتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں. ٹھہر جاتے ہیں. کوئی وقت کی پابندی نہیں. کوئی جگہ کا نہیں. میری طرف سے اتنی لا پرواہی مناسب نہیں. کیا آپکو میری طرف سے کوئی بھی خوف دامنگیر نہیں"

میں جواب دیا کرتا تھا.

"شک تو ہمارا پیشہ ہی ہے. اس لئے میں اُسے گھر کے اندر داخل نہیں ہونے دیتا"

"مجھے شک کرنا میرا پیشہ نہیں. بلکہ میرا قاعدہ ہے. اگر مجھے معمولی سا بھی شک کرنے کا موقعہ دیں. تو میں سب کچھ کر سکتی ہوں"

میرا یہ اٹل قول تھا. کہ میں سراغرسانی میں سب سے زیادہ نام پیدا کرونگا. اور یہ ثابت کر دونگا. کہ زمانہ حال میں میرے مقابلہ پر کسی کو ٹھہرنے کی تاب نہیں. جاسوسی افسانہ کوئی بھی ایسا نہ ہوگا. جو میں نے نہ پڑھا ہوگا. اور کوئی واقعہ ایسا نہ ہوگا. جو نہ سنا ہو. مگر اس کام سے فائدہ اُٹھانے کی بجائے نقصان ہوا. اور دل کی بے صبری اور گھبراہٹ میں اضافہ ہونے لگا.

کیونکہ ہمارے ملک کے مجرم ڈرپوک اور معمولی ہوتے ہیں. اُن میں پیچیدگی اور راز نام کو بھی نہیں ہوتا. اس ملک کا قاتل قتل کی پُراسرار خوفناک واردات کو کسی بھی حالت میں پردۂ راز میں نہیں رکھ سکتا. ہم

جو جال پھیلاتے ہیں۔ وہ اُسمیں بہت جلد خود ہی پھنس جاتا ہے۔ جرم کے گورکھ دھندے سے نکلجانے کا پُراسرار ذریعہ وہ نہیں جانتے۔ ایسے دیش میں سی۔آئی۔ڈی میں نہ آرام ہے اور نہ عزت۔

بڑے بازار کے مارواڑی ٹھگ کو جلد ہی گرفتار کر کے کئی بار میں اپنے دل ہی دل میں کہتا ہوں۔

اے مجرم! خاندان کو دھبہ لگانے والے۔ دوسروں کا ستیاناش کرنا عالم اور ہوشیار اُستادوں کا کام ہے۔ تجھ ایسے بے سمجھ جاہل کو تو سیدھا سادا ہونا چاہیئے تھا!

اسی طرح کئی قاتلوں کو پکڑ کر میں نے اُن کو بھی پھٹکارا ہے۔ پھانسی کی رسی کیا تجھ ایسے بے عزت آدمیوں کے لئے ہی تیار ہوئی ہے۔ تم لوگوں میں نہ غور و خوض کی طاقت ہے۔ اور نہ ہی تمہارا دل اتنا مضبوط ہے کہ اپنے مقصد میں مکمل کامیابی حاصل کر سکو۔ پھر تم قاتل بننے کے فضول خیال کو دل میں جگہ ہی کیوں دیتے ہو؟

تخیل کی نہر میں جب میں لنڈن اور پیرس کے بارونق راستے کے آس پاس کھڑا۔ اور سردی سے بھری ہوئی آسمان سے باتیں کرنے والی عمارتیں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے!

میں سوچتا تھا۔ کہ جس طرح ان عمارتوں، سڑکوں اور گلیوں کے درمیان انسانوں کی آمد و رفت، قسمت کے چکر، رنج و راحت کے دور، حُسن کی ندیاں ہر وقت ضو پاشیاں کرتی رہتی ہیں۔ ویسے ہی ہر جگہ ایک خوفناک بھیانک، سیاہ، پیچیدہ اور ڈراؤنا جرم بھی نیچے ہی نیچے پوشیدہ طور پر اپنا راستہ بناتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اُسی کے پاس یورپ کی تہذیب کے دلچسپ، عیش و عشرت نے ایسی خوفناک اور دلکش شکل حاصل کی ہے!

اور اس کے مقابل ہمارے کلکتہ کی سڑک کے پاس کھُلی کھڑکیوں والے

مکانوں میں کھانا پکانا، گھر کے کام، استاد کے سبق، تاش، شطرنج کے کھیل، عورت، مرد کا جھگڑا، بھائی بھائی کی لڑائی، مقدمے بازی کی صلاح وغیرہ کے علاوہ کوئی زیادہ بات نہیں۔ کسی مکان کی طرف دیکھکر یہ بات دل میں نہیں آتی۔ کہ شاید اسوقت اس مکان کے اندر کسی پوشیدہ مقام پر پڑا کوئی شیطان چپ چاپ اپنا کام سرانجام دے رہا ہے؛

میں اکثر رستے میں آنے جانے والوں کے چہرے اور چال دیکھکر اندازہ لگایا کرتا تھا۔ جس کا رنگ ڈھنگ چہرہ وغیرہ مجھے کچھ بھی شک آمیز معلوم ہوتا۔ میں اسکا تعاقب کرتا؛

اس کا نام مقام اور چال چلن کے متعلق معلومات حاصل کرتا لیکن آخر کار ناکامی کے ساتھ یہ معلوم ہوتا کہ بلے داغ آدمی ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے بھائی بند بھی اُن کی عدم موجودگی میں انہیں برا بھلا نہیں کہتے؛

راہ چلنے والوں میں جو مجھے سب سے زیادہ بدمعاش معلوم ہوتا یہاں تک کہ جسے دیکھ کر مجھے یقین ہو جاتا۔ کہ یہ ابھی ابھی کوئی ہیتناک کام سرانجام دے کر آ رہا ہے۔ اس کے حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ وہ کسی اسکول کا ماسٹر ہے۔ اور سکول سے واپس ہوکر گھر جا رہا ہے۔ یہی سب آدمی اگر کسی دوسرے ملک میں پیدا ہوتے۔ تو نامی چور یا ڈاکو ہو سکتے ہیں۔ صرف مناسب قوت ارادی اور مناسب دماغ نہ رہنے سے ہی ہمارے ملک میں یہ تمام زندگی ماسٹری کرتے کرتے ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ اور آخر پنشن پر گذارہ کرتے ہیں۔ بہت کوشش اور جانفشانی کے بعد مندرجہ بالا ماسٹر کی دوڑ دھوپ پر مجھے جیسی نفرت ہوئی۔ ویسی مجھے کسی معمولی چور پر بھی نہیں ہوئی؛

آخر کار ایک دن شام کے وقت اپنے گھر کے پاس ہی ایک گیس پوسٹ کے نیچے میں نے ایک آدمی کو دیکھا۔ وہ بغیر کسی ضرورت کے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا چکر لگا رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے یقین کامل ہو گیا۔ کہ یہ کسی خوفناک

ناپاک ارادے سے یہاں ٹہل رہا ہے۔ خود اندھیرے میں رہ کر میں نے اس کے چہرے کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ میں نے دل میں خیال کیا۔ کہ کسی پُراسرار کام کو انجام دینے کے لئے ٹھیک ایسے چہرے کی ضرورت ہے۔ جسکا چہرہ ہی خوفناک ہے۔ اُن کے لئے کسی قسم کا جرم کرنا ہی درست نہیں!

کسی کے برابر بھی کام کے ذریعے کامیابی حاصل کرنا ان کے لئے ناکامیابی ہی ہے!

میں نے دیکھا۔ کہ اُس نوجوان کا چہرہ ہی اُس کے لئے زیادہ مددگار ہے میں نے اپنے دل میں خیال کیا

"خدا نے جو بے نظیر عقل تجھے عطا کی ہے۔ اگر تم اسے درست استعمال کرتے۔ تو میں تمہیں مرحبا کہتا!

اندھیرے میں یک دم اُس کی پیٹھ کو تھپکی دے کر میں نے کہا۔

"کہو دوست! اچھے تو ہو؟"

وہ یک دم گھبرا سا گیا۔ اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا!

میں نے کہا۔

"معاف کیجئے۔ میں بھول گیا ہوں۔ میں نے کوئی اور ہی خیال کیا تھا"

مگر دراصل میں نے جو کچھ سمجھا تھا۔ وہ ٹھیک تھا۔ مگر اُس کا اسطرح چونک پڑنا مجھے اچھا معلوم نہ ہوا۔ اس کی قابلیت پر مجھے شک ہو گیا اسے اپنے جسم پر مکمل قابو رکھنا چاہیئے تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال ہے۔ کہ مجرموں کو پوری قابلیت کم ہی پائی جاتی ہے۔ چور کو بھی پکا چور بنانے میں قدرت کی طرف سے کمی دیکھی گئی ہے!

چھپ کر میں نے دیکھا۔ کہ وہ ڈر کے مارے گیس پوسٹ چھوڑ کر چلا گیا۔ تعاقب کرنے پر معلوم ہوا! کہ وہ "گول دیگی" (ایک بازار کا نام

ہے۔ میں داخل ہو کر تالاب کے کنارے گھاس پر چت لیٹ گیا ہے۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کسی مجرم کے متعلق سوچنے کے لئے اس سے موزوں جگہ نہیں مل سکتی۔ گیس پوسٹ کی بجائے یہ جگہ بہت ہی بہتر ہے۔ کوئی شک بھی کرے تو زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتا ہے کہ یہ نوجوان اس اندھیرے میں اپنی معشوقہ کے چہرے کا تصور باندھ کر اپنے دل کے اندھیرے کی روشنی کر رہا ہے۔ اس شخص کی طرف دم بدم میرا خیال کھنچنے لگا۔

کافی تلاش کے بعد اس کے گھر کا پتہ لگایا۔

اُس کا نام "شنکر" ہے۔ کالج کا سٹوڈنٹ ہے اور امتحان میں فیل ہو گیا ہے۔ اب موسم گرما کی تعطیلات میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے۔ اسکے ڈیرے میں رہنے والے تمام طالب علم اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں۔ اتنی لمبی چھٹیوں میں سبھی طالب علم اپنے گھر چلے جاتے ہیں مگر یہ نہیں گیا۔ اب یہ خیال پیدا ہوا کہ اس لڑکے کو کون سا ایسا کام ہے جو گھر جانے نہیں دیتا۔

میں بھی طالب علم بن کر اُسکے ڈیرے میں ایک کوٹھڑی کرایہ پر لیکر رہنے لگا۔ پہلے دن جب اس نے مجھے دیکھا۔ تو بالکل نیا اور پُراسرار انداز تھا۔ اُسکے اس نئے انداز کو میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ بہت حیران ہے۔ اس نے میرے مطلب کو شاید تھوڑا بہت سمجھ لیا تھا۔ میں نے سوچا۔ کہ یہ ہی اصل شکاری کے قابل شکار ہے یہ آسانی سے قابو میں لایا جا سکتا ہے۔

لیکن میں نے جب ظاہری طور پر اُس سے دوستی کرنے کا ڈھونگ بنایا۔ تب وہ جلدی ہی میرے ہاتھ آ گیا۔ اُسنے ملنے میں کچھ بھی شک یا نفرت کا خیال نہیں دکھایا۔ مگر پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ یہ بھی مجھے تیز نظر سے دیکھتا ہے۔

شاید وہ مجھے پہچاننا چاہتا تھا۔ انسانی اخلاق کی طرف سے اس

طرح سد بارعب اور بھانپنے والے خیالات رکھنا بھی اُستاد کی ایک خاصیت ہے اس تھوڑی سی عمر میں اتنی بڑی دانائی دیکھکر میں بہت خوش ہوا۔ میں نے دل ہی خیال کیا۔ کہ بیچ میں کسی حسین عورت کو ڈال لینا چاہیئے۔ اُس سے نامعقول منچلے لڑکے کے دل کا حال بہت جلد معلوم ہو جائیگا؛

اسلیئے ایک دن رحمدلی اور محبت کا خیال جتا کر میں نے اُس سے کہا۔ "بھائی شنکر! میں ایک عورت کو چاہتا ہوں۔ لیکن وہ مجھے نہیں چاہتی" پہلے تو اُس نے چونک کر میرے منہ کی طرف دیکھا۔ اور بعد میں مسکرا کر کہا "ایسے بُرے خیال کو پایہ تکمیل تک پہنچانا کچھ مشکل نہیں۔ ایسے تماشے کرنے کیلئے ہی تماش بین قدرت نے عورت اور مرد میں یہ فرق بنایا ہے"

میں نے کہا۔ "میں اس معاملہ میں تم سے امداد لینا چاہتا ہوں"

وہ مان گیا۔ میں نے اس عورت کے متعلق بہت سی باتیں بنا بنا کر اُس کو سنائیں۔ شنکر نے یک خیال اور چوکنے کانوں سے اُن تمام باتوں کو سُنا مگر خود خاموش ہی رہا؛

میرا خیال تھا کہ محبت اور خاص کر نفرت انگیز بُرے کام کی محبت کی بات سنکر آجکل کے نوجوانوں کے جوشیلے خیالات بہت جلد بھڑک جاتے ہیں مگر یہاں اُنکا کوئی اثر دکھائی نہ دیا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ سکوت عالم میں رہنے لگا؛

سب کچھ ہونے پر بھی میں یہ بھانپ گیا۔ کہ اُس نے اُن تمام باتوں کو اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ اور اُن کو محفوظ کر لیا ہے کہ بوقت ضرورت کام آئیں اس نادان نوجوان کی اس پُراسرار چالاکی پہ مجھے حیرت انگیز خوشی ہوئی؛

دوسری طرف میں اسکا کچھ پتہ نہ لگا سکا۔ کہ شنکر ہر روز چپکے سے دروازہ بند کر کے کیا کیا کرتا ہے اور اُسکی وہ پوشیدہ کارروائی کہاں تک پہنچی ہے مگر اسمیں شک نہیں۔ کہ وہ بتدریج کسی نامعلوم سڑک پر بڑھا جا رہا

ہے۔ اس کا چہرہ دیکھنے سے معلوم ہو سکتا تھا۔ کہ وہ کسی پوشیدہ معاملات پر غور کر رہا ہے۔ اور وہ کسی دوسرے کو اس معاملہ میں ڈالنا نہیں چاہتا اور یہ بھی معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ اپنی منزل کے نزدیک تر ہو رہا ہے۔ میں نے چھپکر ایک دن کمرہ کھول کر دیکھا۔ اس میں بے شمار پیچیدہ اور نا سمجھ اشعار ایک کاپی میں درج تھے۔ کالج کے لیکچروں کے "نوٹس" اور اپنے گھر کے ممبروں کی چٹھیاں یہ سب تھا۔ اسکا مختصر سامان ؛

گھر کے خطوط سے یہ معلوم ہوا۔ کہ اس کے رشتہ داروں نے اُسکے گھر آنے پر بہت اصرار کیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی گھر نہ جانا۔ اس میں ضرور کوئی پوشیدہ راز ہے۔ اور اگر وہ راز اچھا ہوتا تو دوران گفتگو میں مجھے ضرور معلوم ہوتا۔ لیکن اُس کے بالکل برخلاف ہونے کے خیال سے اُس نوجوان کے چال چلن اور زندگی میرے لئے بہت ہی دلچسپی کا سامان ہو گئے ؛

جو بد تہذیب گروہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو مکمل طور پر چھپائے ہوئے ہے۔ اور خلق خدا کو ہمیشہ ہی تاریکی میں دھکیلتا رہتا ہے۔ یہ طالب علم بھی اس خوفناک جماعت کا ایک رکن تھا۔ یہ لڑکا کالج کا معمولی طالبعلم ہی نہیں۔ بلکہ تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ایک خوفناک تباہی خیز قیامت بپا کرنے والی جماعت کا بانی تھا۔ اور آجکل عینک پوش شوقین مزاج طالب علم کی حیثیت سے کالج میں پڑھتا تھا ؛

اگر یہ خونی ملک الموت کی شکل میں میرے سامنے ہوتا۔ تو میرے خیال میں اُسکی دہشت اتنی خوفناک نہ ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اُسے عزت کی نظر سے دیکھتا ہوں ؛

آخر ایک عورت کو لانا ہی پڑا۔ پولیس سے تنخواہ پانے والی ایک طوائف میری امداد کے لئے تیار ہوئی۔ میں نے شنکر کو بتا دیا۔ کہ میں اس

عورت کا بد قسمت عاشق ہوں۔ اس کے چند دن بعد میں شنکر کیساتھ کول دیگی کے کنارے سے یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

بلا عشق کی یہ کہاں سے لگی ہے
سنا ہے تیرے آستاں سے لگی ہے

اس عورت نے بھی کچھ دلی خیالات سے اور کچھ دوسرے کئی خاص طریقوں سے یہ جتایا کہ میں شنکر کو چاہتی ہوں۔ لیکن جو امید تھی ویسا ثمر نہ ملا۔ بلکہ شنکر دور ہی رہ کر پوشیدہ طور پر حیرانگی سے سب کچھ دیکھنے لگا۔

اسی دوران میں ایک دن مجھے دوپہر کے وقت شنکر کے کمرے کی چٹائی پر ایک خط کے پھٹے ہوئے ٹکڑے ملے۔ اُنکو ملا کر صرف اتنا ہی پڑھا گیا:

"آج شام کو سات بجے پوشیدہ طور پر تمہارے ڈیرے میں۔"

کافی تلاش کے بعد بھی اُس خط کے اور ٹکڑے نہیں ملے۔ میرا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔ ایک بھولی ہوئی داستان جیسے تازہ ہو گئی ہو یا یوں کہو کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا تھا مسرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔

مجھے معلوم تھا کہ آج رات کے دس بجے اسی طوائف کے آنے کی بات بالکل پکی اور مکمل ہو چکی ہے۔ مگر یہ درمیان میں سات بجے کا کیا معاملہ ہے۔

میں نے دل میں کہا۔ لڑکے کا جیسا حوصلہ ہے۔ ویسی ہی تیز عقل ہے اگر کوئی جرم کا کام پوشیدہ رکھنا ہی ہو تو جس دن گھر میں کوئی اور خاص بات ہوئی ہو۔ اسی دن وہ کام کرنا بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے بڑے کام کی طرف سب کا خیال لگا رہتا ہے۔ دوسرے جس دن کوئی خاص کام ہوتا اس دن یہ کوئی بھی نہیں مان سکتا کہ یہاں کوئی دوسرا کام چھپا کر کیا جاوے گا۔

یکایک مجھے خیال پیدا ہوا کہ میری دوستی اور اُس طوائف کے ساتھ محبت کے راز کو بھی شنکر نے اپنا اُلو سیدھا کرنے میں استعمال کرنا شروع

کر دیا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو دور بھی رکھتا ہے اور نہیں بھی۔ میں نے بھی اُس کے پوشیدہ کام میں رکاوٹ ڈال رکھی ہے۔ میں صرف یہی خیال کر رہا ہوں۔ کہ وہ میری اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھا ہوا ہے۔ اور وہ بھی میرے اس باطل شک کو دُور نہیں کرنا چاہتا۔ مگر دراصل وہ اپنا کام کئے جاتا ہے اور بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے؛

ناظرین! خود ہی ان باتوں کو سوچ کر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ باہر سے آیا ہوا طالب علم چھٹیوں میں گھر کیوں نہیں جاتا۔ حالانکہ اس کے رشتہ دار بھی اُسے مجبور کر رہے ہیں۔ ایک سنسان مکان میں بالکل اکیلا رہنا کیا کسی راز سے خالی ہے؛

مگر میں نے اس کے ڈیرے میں آکر اُس کے اکیلے رہنے کی سکیم کو فیل کر دیا۔ اور ساتھ ہی ایک عورت کو بیچ میں ڈالکر ایک نیا جال بچھا دیا ہے؛ تمام کچھ ہوتے ہوئے بھی اُسے کسی قسم کی پرواہ نہیں۔ وہ مکان چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ہم سے دور نہیں رہتا۔ پھر یہ دوست ہے۔ کہ اُسے مجھ پر اور اس طوائف پہ بالکل شک نہیں؛

مگر پھر بھی اُس کی بے خبری میں میں نے اشارتاً دیکھا ہے کہ اُس کے دل میں ہمارے لئے نفرت کے خیالات زور پکڑ رہے ہیں؛

میرے خیال میں تو اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ میری موجودگی کے دوران میں وہ اس غیر آبادی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اور پبلک کی آنکھوں میں دھول ڈالنا چاہتا ہے؛

پہلے شنکر کا چال چلن جیسا بے عزت اور شکوک پیدا کرنے والا تھا۔ اب ویسا نہیں رہا۔ مگر اتنی گہری بات کو یک دم سوچ لینے والا آدمی کیا ہندوستان میں پیدا ہو سکتا ہے۔ کئی بار میرے دل میں سوال پیدا ہوا۔ اور اُس کا جواب شنکر دیکھ کر خوش بھی ہوا۔ شنکر اگر اچھا آدمی

ہوتا۔تو شاید میں اُسے دونو ہاتھوں سے گلے لگا لیتا۔
اس دن ملاقات ہوتے ہی میں نے کہا۔
"آج شام کو سات بجے ہوٹل میں ہماری دعوت کرنیکا خیال ہے۔"
یہ سُنکر پہلے تو وہ چونک پڑا مگر بعد میں اپنے آپ کو سنبھالکر بولا۔
"بھائی! آج معاف کرو۔ مجھے بخار سا ہو رہا ہے۔"
اس سے پہلے شنکر نے ہوٹل میں جانے سے کبھی انکار نہ کیا تھا مگر آج اتنا زبردست انقلاب کیوں؟ آج سات بجے وہ ضرور کوئی پُراسرار کام کرنے والا ہے۔
میں اس دن شام کو پہلے کہیں جانے کے لئے شنکر سے کہہ چکا تھا مگر تیسرے پہر میں نے باتوں کا نہ ختم ہونیوالا ایک بہت ہی دلچسپ سلسلہ شروع کر دیا۔ ایسا میٹھا کہ اُٹھنے کا نام بھی نہ لیا۔ شنکر دل ہی دل میں تلملا اُٹھا۔ میں جو کچھ کہتا تھا۔ اُسی میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میری کسی بھی بات کا اس نے جواب نہیں دیا۔ اور نہ ہی کوئی نیا سوال ہی کیا۔ ہر بات پر خاموش ہی رہا۔ آخر گھڑی کی طرف دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور بولا۔
"شاما! کو لینے نہ جاؤگے؟"
"ہاں! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ بھائی تُم کھانے وغیرہ کا انتظام کر رکھنا میں ٹھیک ساڑھے دس بجے اُسے یہاں لے آؤنگا۔ ہر بات کا مکمل انتظام ہو"
میں اُٹھ کر چلا گیا میرا خون اُچھل پڑا۔ شام کے سات بجے کی باد صبا شنکر کو خوش کر رہی تھی۔ مجھے اس سے کم خوشی نہ تھی۔
میں اس کے ڈیرے کے نزدیک چھپ گیا اور کسی پوشیدہ بات کا انتظار کرنے لگا جیسے کوئی نامراد عاشق اپنی معشوقہ کے انتظار میں پھر رہا ہو بار بار گھڑی دیکھنے لگا۔ شام کا اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ جسوقت سڑک پر سرکاری

لیمپوں کی روشنی ہوئی۔ تو ایک پالکی ہمارے ڈیرے تک پاس آ کر رُکی اُس کے پھاٹک بند تھے۔ چند منٹ بعد وہ شنکر کے دروازے کے سامنے ٹھہر گئی؛

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ یہ کون اس بند پالکی کے اندر ایک مہا پاپ مورتی کی شکل میں کالج کے طالب علم کے ڈیرے میں داخل ہو رہا ہے؛

میں اب دیر نہ کر سکا۔ بہت آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر دو منزلہ پر پہنچا۔ خواہش تھی کہ چھپ کر سب کچھ دیکھ لوں۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ سامنے ہی میری طرف منہ کئے شنکر بیٹھا ہوا تھا۔ اور منہ چھپائے ایک عورت آہستہ آہستہ اس سے باتیں کر رہی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ شنکر نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ تب جلدی سے کمرے میں داخل ہو کر میں نے کہا۔

"بھائی میں اپنی گھڑی یہیں بھول گیا تھا۔ وہی لینے آیا ہوں۔"

مجھے دیکھ کر شنکر ایسا گھبرا گیا۔ کہ ابھی بے ہوش ہونا ہی چاہتا ہے

میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"بھائی! کیا تمہاری صحت کچھ خراب ہو گئی ہے؟"

وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ تب لکڑی کی مورت کی طرح اٹل بیٹھی ہوئی اس عورت کی طرف منہ پھیر کر میں نے سوال کیا۔

"تم شنکر کی کیا لگتی ہو؟"

کچھ بھی جواب نہ ملا۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ عورت شنکر کی کوئی نہیں بلکہ میری ہی بیوی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا ناظرین خود ہی سوچ سکتے ہیں یہ تھی میری پہلی اور آخری جاسوسی ہوئی؛

کچھ دیر بعد گھر آ کر میں نے اپنے دل میں کہا۔ میری بیوی سے شنکر کا بُرا تعلق نہیں ہو سکتا۔ اسی وقت میری نظر ایک فلسفے پر پڑتی ہو۔ تاکی

پر پڑا تھا۔ اُٹھایا۔ لکھا تھا:

منورما!

نامراد شنکر کو تم اتنے دنوں بعد بھول گئی ہو۔ بچپن میں جب ماما کے گھر رہتا تھا۔ تب ہمیشہ تمہارے گھر جا کر تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد یہ حالت بھی بدل گئی۔ تمہیں شاید یاد ہو یا نہ ہو جب میں نے حوصلہ کر کے اور شرم کو بالائے طاق رکھ کر تمہارے ساتھ شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن ہمارے اور تمہارے والدین اس رشتہ پر راضی نہ ہوئے۔ پھر تمہاری شادی ہو گئی۔ چار پانچ سال تک تمہارا حال معلوم نہ ہو سکا۔ آج پانچ مہینے ہوئے مجھے خبر ملی کہ تمہارے خاوند محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی میں نوکر ہو کر کلکتہ چلے گئے ہیں۔ میں بھی یہیں پڑھ رہا تھا یہاں میں نے تمہارے گھر کا پتہ لگایا:

تمہارے ساتھ ملاقات کرنے کا بُرا خیال نہیں رکھتا۔ اس بات کو بھگوان جانتے ہیں۔ کہ تمہارے خانگی آرام میں خلل انداز نہیں ہونا چاہتا شام کے وقت تمہارے گھر کے سامنے گیس پوسٹ کے نیچے کھڑا رہتا ہوں تم ٹھیک ساڑھے سات بجے ہر روز ایک لیمپ اپنے اوپر کے کمرے میں کھڑکی کے پاس رکھ آتی ہو۔ اُسی وقت دم بھر تمہارے درشن کر کے میں اپنے آپکو خوش نصیب تصور کرتا ہوں۔ اتنا جرم ضرور مجھ سے ہوتا ہے:

اسی دوران میں اتفاقاً تمہارے خاوند سے ملاقات ہو گئی ہے اور اُس نے آہستہ آہستہ دوستی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ انکی زندگی جیسی میں نے دیکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم سکھی نہیں ہو۔ تمہارے اوپر میرا سوسائٹی کے طرف سے حق نہیں۔ مگر جس قدرت نے تمہیں یہ تکلیف دی ہے اس نے یہ تکلیف دور کرنیکا کام مجھے سونپا ہے!

اسلئے پچھلی تمام باتوں کو بھولکر شکروار شام کے وقت سات بجے پانی میں

بیٹھکر میرے ڈیرے میں آؤ۔ میں پوشیدہ طور پر تمہارے خاوند کی بہت سی باتیں تمہیں سناؤنگا۔ اگر تم کو میرے کہنے پر اعتبار نہ ہو تو جو کچھہ میں نے کہا ہے اسکا ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ اور تمہیں کچھہ مشورہ بھی دینا چاہتا ہوں۔ میں ایشور کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ میرے مشورہ پر عمل کر کے تم سکھی ہو سکتی ہو؛

میرا یہ تمام ارادہ بالکل خود غرضی سے خالی نہیں۔ میری یہ زبردست خواہش ہے کہ چند منٹ تمہیں دیکھ لونگا۔ تم سے باتیں بھی ہونگی۔ اور تمہارے پوتر چرنوں کے چھونے سے میرا گھر بھی پوتر ہو جائے گا؛

اگر تم کو مجھہ پر اعتبار نہ ہو۔ اور اس خوشی سے بھی مجھے محروم رکھنا چاہتی ہو تو مجھے صاف طور پر لکھہ دینا۔ تب خط میں ہی لکھ کر تمام باتیں تمہیں بتا دونگا۔ اور اگر خط لکھنے کا بھی ارادہ نہ ہو تو میری یہ چٹھی اپنے خاوند کو دکھا دینا۔ اسکے بعد مجھے جو کہنا ہے میں سب انہیں سے کہونگا؛

ہر وقت یاد کرنے والا

شنکر دیال

خط پڑھنے کے بعد میرا تمام شک رفع ہو گیا۔ اپنی سراغرسانی میں نام پیدا کرنے کی خواہش اور ساتھ ہی پولیس کی نوکری کو اسی دن سے خیر باد کہہ دیا۔

تاجران کتب کیلئے نادر موقع
کنول بکڈپو چوک گھنٹہ گھر امرتسر کی خدمات
حاصل کریں